کالونیلزم
محکومیت
غلامی

اقبال کی فکر و نظر میں



خالد سردار

کالونیل ازم۔ محکومیت۔ غلامی

اقبال کی فکر و نظر میں

خالد سردار

نگارشات

نام کتاب: کالونیل ازم۔ محکومیت۔ غلامی (اقبال کی فکر ونظر میں)

مصنف: خالد محمود
استسٹنٹ پروفیسر اُردو
دیال سنگھ کالج، لاہور

ناشر: آصف جاوید (0321-9414442)

برائے: نگارشات پبلشرز، میاں چیمبر 3۔ ٹمپل روڈ، لاہور
فون: 0092-42-36303438

Facebook:nigarshatpublishers-Email nigarshat@yahoo.com

مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور

سال اشاعت: 2019ء

قیمت: -/300 روپے

انتساب

والد محترم مرحوم

بابا سردار خان

والدۂ محترمہ مرحومہ

فضل بیگم

کے نام

جن کی محبتوں کی بارشیں اب بھی مجھ پر برستی رہتی ہیں
ان کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے بعد
زندگی گزارنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے

ترتیب

الفاظ میں نقشہ کھینچا۔

''لیکن انگریزی حکومت میں معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ تاتاری حملہ یقیناً خراب تھا لیکن ہمارا تحفظ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے۔ وہ تاتاریوں کی دشمنی تھی اور یہ ہماری دوستی ہے۔ ہمارے مفتوحہ علاقے کی بدحالی آج بھی ویسی ہے جیسے بیس سال بیشتر تھی۔ ہندوستان سے ہمدردی کیے بغیر ان پر لونڈے حکومت کر رہے ہیں۔ ہر وہ روپیہ جو انگریز نفع میں حاصل کرتا ہے دراصل ہندوستان کا نقصان ہے۔'' (باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت)

1770ء میں بنگال قحط کا شکار ہو رہا تھا۔ اس قحط نے ایک تہائی آبادی کو موت کی نیند سلا دیا۔ کمپنی کے ملازموں نے انسانی نعشوں کے اوپر کھڑے ہو کر محاصل اور مالیہ کا مطالبہ کر دیا۔ کمپنی کے فلک بوس گوداموں کے سایہ میں لوگ دانے دانے کے لیے تڑپ کر مر گئے لیکن کمپنی نے گوداموں کو بدستور مقفل رکھا۔ (باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت)

یورپ میں ہندوستانی کپڑا کالیکو کے نام سے مشہور تھا۔ سوتی کپڑے کے علاوہ ریشمی کپڑا بھی یورپ بھیجا جاتا۔ کپڑے کے علاوہ ریشمی رومال، باناتی ٹوپیاں، چینی کے برتن، شورہ اور نیل بھی درآمد کیا جاتا۔ سر ولیم ڈگبی کے الفاظ میں انگلستان کو صنعتی انقلاب اس وجہ سے ملا کہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ 1750ء کے معاشی اور تجارتی انگلستان کا 1790ء کے انگلستان سے مقابلہ کیا جائے تو انگلستان پر جنگ پلاسی کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔۔ 21 جنوری 1798ء کو سعادت علی نواب وزیر بنا دیا گیا اسی دن سعات علی اور سر جان شور کے درمیان سترہ صفحات پر مشتمل ایک معاہدہ ہوا صرف ایک دفعہ کی رو سے دس لاکھ روپیہ نقد اور الہ آباد کا قلعہ کمپنی کے قبضہ میں چلا گیا۔ نواب وزیر آصف الدولہ کے ہاں 33 سال کی عمر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نوزائیدہ کا نام وزیر علی رکھا گیا۔ نواب آصف الدولہ کا بھائی سعادت علی چونکہ نوابی کا امیدوار تھا اس نے بچے کی پیدائش کو اپنی موت خیال کیا۔ وزیر علی کو حرامی بچہ مشہور کرنے میں سعادت علی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ (باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت)

نادر شاہ غصے میں آ گیا اس نے ایرانی سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم دے دیا۔ بچے، بوڑھے اور جوان بغیر امتیاز کے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ شہر میں آگ لگا دی گئی۔ تخت طاؤس کے علاوہ چالیس کروڑ روپیہ نادر شاہ کے قبضہ میں آیا۔ (باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت)

غازی الدین نے لاہور کے قلعہ میں داخل ہو کر میر منوں کی بیوہ کے زر و مال کو لوٹ لیا۔ اس پر احمد شاہ ابدالی بہت غصہ میں آیا۔ لاہور کے بعد احمد شاہ ابدالی دہلی پہنچا۔ احمد شاہ ابدالی نے غازی الدین کو معاف کر دیا لیکن اس کے سپاہیوں نے دہلی میں قتل عام کیا۔ شہر والوں کو لوٹا۔ 1757ء میں احمد شاہ ابدالی دہلی سے واپس ہوا تو وہ اپنے بیٹے تیمور کو لاہور کا حاکم بنا گیا۔ (باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت)

مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی ہلکی سی جھلک سیاسی اور معاشی حوالے سے اوپر والے اقتباسات سے جھلکتی ہے۔ میر تقی میر مغلوں کے زوال کو جان چکے تھے۔

درہمی حال کی ساری ہے مرے دیوان میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

بادشاہوں کا تخت پر بیٹھنا پھر اترنا اندھا کر دیا جانا یا قید کر دیا جانا یا قتل کر دیا جانا یہ سب میر نے اپنے انداز میں شعروں میں ڈھالا ہے۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

آباد اجڑا لکھنو چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر کے خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے اب

تاج پر غرور کرنے والے سر پر نوحہ خوانی۔ جن کے پاؤں کی خاک لوگ آنکھوں میں لگاتے تھے اُن آنکھوں میں سلائیاں پھرتی دیکھنا۔ شہروں کا اجڑنا آباد ہونا سکھ، مرہٹے، چور چکے اور بادشاہ اور گداگر سب ہی دولت کے خواہاں ہو چکے ہیں۔ ایسے میں جو کچھ نہیں رکھتے وہ ہی چین سے ہوں گے اور ایسے میں فقر بھی ایک دولت بن گیا ہے۔

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

سپاہی سے جوگی بننے کا سفر کوئی آسان سفر نہیں ہے اس میں اہل ہند نے قریباً قریباً سب کچھ کھو دیا تھا۔ حکمرانی، عزت، دولت اور پھر جوگ لے لیا۔ میر کے دور میں انگریز لوٹ مار کر رہے تھے، پاؤں جما رہے تھے۔

غالب تک آتے آتے انگریزوں کی حکمرانی مستحکم ہو جاتی ہے۔

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے؟
ہم نے چاہا تھا مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

زندگی اہل ہند سے چھن چکی ہے۔ موت ان پر طاری ہے۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں؟

یار کی جگہ پر انگریز حکمرانوں کو رکھ لے تو شعر اور لطف دے گا۔

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

پھر مظالم میں لطف لینے کی منزل آ جاتی ہے۔ اردو شاعری میں اگر محبوب معشوق کو حکمران اور پھر غیر ملکی حکمران سمجھ لیں اور عاشق بیچارے کو عوام سمجھ لیں تو اردو شاعری کے مفاہیم کے نئے در وا ہوں گے۔ محبوب کی ادائیں ناز ونخرے، ظلم وستم اور عاشق کی ناچاری، لاچاری، عزت وآبرو اور انا سے تہی دامن ہونا (بے شک کبھی کبھی عاشق انا بھی دکھاتا ہے) شاعروں کے تہہ دار انداز کی پرتیں اترتی ہیں۔

ع طرفیں رکھے ہے چار چار شعرِ میر
ع گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

میر کے بعد غالب اور پھر اقبال کا دور آتے آتے حکمرانوں کے مظالم اور غلام ہندوستانیوں کی مظلومیت مستحکم ہو چکی تھی۔ غالب اور اقبال کے درمیان مرزا داغ دہلوی اہم شاعر ہیں۔ افسوس داغ کا مطالعہ دورِ غلامی کو سامنے رکھ کر نہیں کیا گیا۔ داغ کا ایک شعر:

میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

اس میں آشیاں داغ کا گھرانہ، چمن ہندوستان ہے اور آندھیاں انگریزوں کی حکمرانی اور ظلم ہیں۔ میر، غالب اور داغ کا مطالعہ غلام ہندوستان کو سامنے رکھتے ہوئے سیاسی نقطہ نظر سے کیا جائے تو اقبال کا فکر وفلسفہ زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اور اقبال کی شاعری میں ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت کئی انداز سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس میں سیاسی پہلو، معاشی لوٹ مار، اخلاقی تباہی ہے۔ مشرقی روایت کی تباہی اور مغرب کی نقالی ہے۔ انفرادی غلامی سے لے کر اجتماعی غلامی کے ہزار رنگ ہیں اور اقبال نے ہزار رنگ میں اس کو واضح کیا ہے۔ کالونیلزم پر بڑا ادب لکھا گیا ہے، میں اس کے حوالے نہیں لانا چاہتا کیونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں غیر ملکی آقاؤں کی لوٹ مار کے ہر رنگ کو واضح کر دیا ہے۔

میری دوسری دونوں کتابیں۔

1- صوفی وملا: اقبال کی فکرونظر میں

2- مزدور۔ سرمایہ دار۔ کسان۔ جاگیردار۔ مقدر۔ کوشش۔ اقبال کی فکرونظر میں

ان تین کتابوں کو پڑھنے کے بعد اقبال کی نئی تفہیم سامنے آئے گی۔

جامعات کے اندر بھی اور جامعات کے باہر بھی چند اشعار اور چند استعاروں میں اقبال کو قید کر دیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد مطالعہ اقبال میں وسعت آئے گی۔ پی۔ ایچ، ڈی کے مقالات کے لیے ان عنوانات جو کہ اقبال کے کلام کا حاصل ہیں درخور اعتنا سمجھا جائے گا۔ مولانا غلام رسول مہر کی کتاب مطالب کلام اقبال اردو سے مدد لی گئی ہے۔ ویسے بھی اقبال ہندوستان کے مسلمانوں سے خاص طور پر اور دنیا کے مسلمانوں سے مخاطب ہے، سیدھے سادے انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس طرح تفہیم کرتے ہوئے کہیں کہیں آپ کو مترادفات کا احساس ہوگا حالانکہ کوئی لفظ دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہوتا، اقبال بار بار مسلمان غلاموں کو اس غلامی سے نکالنے کی بات کرتے ہیں تو تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تکرار ایک حکیم کی ایک مریض کی بے حسی اور مرض کی شدت کی وجہ سے ہے۔

خالد سردار (خالد محمود)

اسسٹنٹ پروفیسر

دیال سنگھ کالج، لاہور

غزلیات

اس چمن میں مرغِ دِل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

چمن ۔مرغ دل ۔آزادی کا گیت ۔آہ! یہ گلشن نہیں ۔ایسے ترانے کے لیے ۔ہندو پاک کی مجبوری بے چارگی کا واشگاف اظہار ہے ۔قابض حکمران کوشش کرتے ہیں کہ محکوم کے دل میں بھی آزادی کی خواہش پیدا نہ ہونے دیں ۔اس کے لیے قابض حکمران طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں ۔اقبال کا دل اسی قید و پابندی پر کڑھتا ہے ۔آہ! یہ گلشن یہ ملک یہ خطہ زمین جو غیروں کے قبضے میں ہے اس میں آزادی کے ترانے نہیں گائے جا سکتے! اکثر طاقتور غیر ملکی قوتیں اپنی حکمرانی کو محکوموں کے لیے اکسیر قرار دیتی ہیں اور اپنی چالاکیوں سے محکوم قوموں میں سے ایسے افراد اور گروہ فراہم کر لیتی ہیں جو اس حکمرانی کو نعمت قرار دینے لگتے ہیں ۔اسی طرح معاشی اور نفسیاتی اور سیاسی چالاکیوں سے اسیر پرندوں کے دل سے آزادی کا جذبہ ہی ختم کر دیا جاتا ہے مگر پھر بھی دل میں اگر یہ جذبہ موجزن رہے بے شک زباں تک نہ آئے تب بھی امید ہے جلد ہی دل سے نکل کر یہ جذبہ آزادی زبان تک بھی آ ہی جائے گا ۔اسی لیے قابض غیر ملکی حکمرانوں کی کوشش ہوتی ہے کہ دل میں بھی یہ امید نہ رہے!

قربِ سلطان

تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی
مجال کیا کہ گداگر ہو شاہ کا ہمدوش
جہاں میں خواجہ پرستی ہے بندگی کا کمال
رضائے خواجہ طلب کن قبائے رنگیں پوش
مگر غرض جو حصولِ رضائے حاکم ہو
خطاب ملتا ہے منصب پرست و قوم فروش

حاکم اور محکوم کا فرق ختم نہیں ہوتا۔ ایک گداگر کس طرح بادشاہ کا ہمدوش ہو سکتا ہے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ خواجہ پرستی میں جُت جائے۔ خواجہ کی رضا کے لیے رنگین لباس پہن لیا۔ یعنی اپنی فطرت۔ سیرت۔ انا غرض سب کچھ بدل دیا اس ایک مصرعے میں اقبال نے محکوموں کی ذہنی پسماندگی اور پستی کو واضح کیا ہے۔ قبائے رنگیں پوش دراصل اندرون کی پسپائی ہے۔ دل کی کہانی ہے۔ دماغ کی پسماندگی ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کی وجہ حاکم کی رضا کی غرض سے ہو تو پھر لوگوں کی طرف سے جو خطاب ملتا ہے جس کو عوامی خطاب بھی کہہ سکتے ہیں وہ یا تو منصب پرست کہا جاتا ہے یا پھر قوم فروش۔ منصب کا لالچ عہدے کا لالچ اور ہوس کی طرف اکبرالٰہ آبادی

اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

پوری نظم نو دس اشعار پر مشتمل ہے۔ مگر ان تین شعروں میں محکوم قوم کی نفسیات اور فطرت

واضح کی ہے۔ اقبال نے صدیوں کی حقیقت بیان کر دی ہے۔ آریا اس دیش میں آئے تو اُنہوں نے دراوڑوں کو داس یعنی غلام بنالیا۔ ہزاروں سال بعد انگریز آئے تو انہوں نے بھی کالے اور گورے کی تمیز قائم کی۔ آریا بھی اپنے آپ کو گورا اور محکوموں کو کالا کہتے تھے۔ انگریزوں نے اپنی بستیاں Cicil Line کے نام سے محکوموں سے ہٹ کر اسی طرح اپنی سیر وتفریح کے لیے کمپنی باغ بنوائے۔ جن کو محکوم صرف خیالی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے۔ لباس اور تراش خراش اور بناوٹ میں کوشش کر کے حاکم کی برابری کی بھونڈی کوشش کی جا سکتی ہے۔ مگر حاکم اس تمیز کو سختی سے قائم رکھتے ہیں۔ ایسے نقال اشخاص اور گروہ عوام کی طرف سے قوم فروش اور منصب پرست کا خطاب پاتے ہیں!

ایک مکالمہ

اک مرغ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے
پردار اگر تو ہے، تو کیا میں نہیں پردار؟
گر تو ہے ہوا گیر، تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے، نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحب پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائل پندار!
مجروح حمیت جو ہوئی مرغِ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمت مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیمن، اُنہیں گردوں سے سروکار
تو مرغ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صددِ دانہ بہ انجم زدہ منقار

مکالمہ ہے دو ہم جنسوں! ایک گھریلو یا محکوم پرندہ ہے اور دوسرا آزاد۔ گھریلو پرندہ آزاد پرندے سے کہتا ہے کہ تیرے بھی پر ہیں۔ میرے بھی پر ہیں تو ہوا میں اڑتا ہے میں بھی اڑتا ہوں۔ تو آزاد ہے تو میں بھی قید یا گرفتار نہیں۔ پرواز تیری میری مشترک خصوصیت ہے تو تم

کیوں اپنے آپ پر نازاں رہتے ہو!

جب مرغ آزاد نے مرغ اسیر کی دل دکھانے والی گفتگو سنی تو اس کی غیرت وحمیت کو تکلیف ہوئی تو مرغ اسیر کو کہا کہ اس میں تو شک نہیں کہ تجھ میں مجھ میں پرواز مشترک وصف ہے مگر تیری پرواز گھر کی چار دیواری کے اندر یا پھر گھر کی دیواروں تک محدود ہے۔تو خاک نشین ہے تجھ کو کیا علم کہ آزاد کی پرواز کی کوئی حد نہیں ہوتی۔گردوں آزاد کے زیرِ پَر ہوتا ہے۔تیری قوم کا رزق خاک میں ہے اور تو خاک میں تلاش کر آزاد تو ستاروں کو دانہ سمجھ کر چونچیں مارتے ہیں۔اقبال نے اشاروں میں کیا کچھ نہیں واضح کر دیا۔کالونیلزم کس طرح محکوموں کے دماغ اور دل کو مطمئن اور آسودہ کر دیتا ہے۔وہ اپنی غلامی اور محکومی کو بھی آزادی کا نام دینے لگتے ہیں۔دیوار تک اڑنے کی آزادی کو آزادی سمجھنے لگتے ہیں۔اقبال فلسفہ،ادب،تاریخ اور اسلامی تاریخ کے جاننے والے تھے۔مگر جب اقبال غلامی اور محکومی کا ذکر کرتے ہیں تو ایک نفسیات دان کے طور پر سامنے آتے ہیں۔شعور، لاشعور اور اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور پر اثرات سامنے رکھ دیتے ہیں کہ کس طرح غلام قوم غلامی میں خوش رہتی ہے اور غلامی کو غلامی نہیں سمجھتی۔ ایڈلر اور یونگ کے حوالوں سے ہم اقبال کے کلام کی وضاحت نہ کریں گے۔نظم کے پہلے حصے میں مرغ اسیر کا اپنے آپ کو آزاد سمجھنا اور دوسرے حصے میں آزاد نے اسیر کو آزادی کے وہم اور خواب اور سپنے سے نکال کر حقیقت کا سامنا کروایا ہے۔ہندوستان میں اقبال کے دور میں کئی نامور لوگ انگریزوں کی محکومی کو نعمت غیر مترقبہ قرار دیتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ اتنی آزادی پہلے حاصل نہ تھی یعنی مسلمانوں کے دور حکمرانی کو انگریزوں سے زیادہ بدتر قرار دیتے تھے۔مسلمان دشمنی میں انگریز کی حکمرانی اچھی کہتے تھے تو اقبال ایسے دانشوروں پر واضح کرتے ہیں کہ یہ نام نہاد آزادی دراصل تیری فطرت اور طبیعت اور سوچ کے سبب سے ہے۔ورنہ کہاں مرغ آزاد جس کی پرواز ستاروں تک ہے اور کہاں مرغ اسیر اڑ کر دیوار تک بیٹھنے کو آزادی سمجھ بیٹھا ہے۔

سلطنت

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقہء گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے' اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال کی عظیم نظموں میں ایک یہ بھی ہے۔ انسان اور سماج کو کیا کیا کیسے کیسے اور کون کون سے سے معاملات سے معاملہ پڑتا ہے۔ اور اس دنیا میں کیا کیا عیاریاں ہوتی ہیں اور کس طرح عیار اور مکار انسان اور گروہ کیسے سیدھے سادھے، ناسمجھ اور کم سمجھ انسانوں کو اپنی عیاریوں اور مکاریوں میں جکڑ کر اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور کس طرح چالبازیوں سے ان غلاموں کو غلامی پر رضامند کر لیتے ہیں۔ اگر کبھی غلام محکوم اس خواب سے بیدار ہوتا ہے تو حکمران کسی نہ کسی چالاکی اور چالبازی سے غلاموں کو پھر سلا دیتے ہیں اور غلام بھی غلامی کی میٹھی نیند میں کھو جاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبال نے محمود و ایاز کا ذکر کر کے کیا کیا رخ نہیں عیاں کر دیے کہ کس طرح آقا غلاموں کو غلامی پہ رضامند کرتے ہیں۔ ایاز محمود کا غلام تھا اور اس زمانے میں غلاموں کی فطرت اسی غلامی کی اسیر ہو چکی تھی کہ غلام غلامی پہ ناز کرتے تھے۔ ایاز کی آنکھ محمود یعنی حاکم کی تاثیر یعنی ساحری سے گردن میں پڑے غلامی کے طوق کو ساز دلیری سمجھتی تھی۔ اس شعر میں پختہ ہوئی غلاموں کی فطرت کو اقبال نے کس رنگ میں بیان کیا ہے۔ یہ اقبال کے فن کی عظمت ہے اس میں جو فنی خوب صورتی اور کمال ہے وہ چونکہ ہمارا موضوع نہیں ہے ہم صرف پیغام اقبال تک محدود رہتے ہیں۔ غلام جب غلامی کو قبول کر لیتے ہیں تو یہ پختہ ہو کر اُن کے لیے فخر بن جاتی ہے۔

مگر یہ صورت حال لمبا عرصہ تک نہیں رہتی کوئی نہ کوئی موسیٰ پیدا ہو کر مظلوموں کو غلاموں کو طلسم ساحری سے نجات دلا دیتا ہے۔ دنیا کا آقا و مولا تو صرف اور صرف ایک ذات ہے۔ باقی تو بت ہیں جو یا تو عوام نے ناسمجھی سے آقا بنا لیے ہیں یا پھر وہ اپنی چالاکی اور ساحری سے

آقا بن بیٹھے ہیں۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی فطرت آزاد کو غلامی سے رسوا نہ کرے۔ یہاں فطرت آزاد بلیغ استعارہ ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ انسان کے ضمیر میں آزادی ہے۔ مگر ظالم اور چالاک اور مکار حکمران اپنی مکاریوں عیاریوں سے اس آزادی پسند فطرت کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اقبال یہاں انسان کو بتاتے ہیں کہ تمھاری فطرت کو فطرت نے آزاد پیدا کیا ہے۔ غلامی اس کے لیے رسوائی ہے۔ اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی آزاد فطرت کو غلامی کی اسیری سے رسوا نہ ہونے دے۔ جب بھی ظالم حکمران مخلوق خدا کو غلام بنا لیتے تھے تو تاریخ انسانی گواہ ہے کہ کوئی نہ کوئی مردِ حُرا اٹھتا اور اس غلامی کے طوق کو توڑ ڈالتا۔

یہاں اقبال ہندوستان کی طرف آتے ہیں اور اقبال مجلس آئین، اصلاح، رعایات اور حقوق سے اپنے دور کے فراعین کے طریقہ واردات کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ تمام نعرہ ہائے دلفریب بیماروں کے علاج کی دوا نہیں بلکہ خواب آور چیزیں ہیں۔ یہاں اقبال نے طب مغرب ترکیب رکھ کر ایلوپیتھی طریقہ واردات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ اس میں بیماری یا درد کے علاج کے بجائے خواب آور دوا استعمال کروائی جاتی ہے جس میں مریض کو درد کا احساس نہیں ہوتا۔ جس میں مریض بے حس ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں کے عوام کو بھی نشہ آور ادویات یعنی رعایات، حقوق، اصلاح اور مجلس آئین کے نشہ آور انجکشن لگا کر ان کے دل و دماغ کو سُن کر دیا ہے۔ یعنی ہندوستان کے غلاموں کو دل و دماغ کو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ (ایلوپیتھی طریقہ انسانوں کے لیے فلاح ہی ہے اس ترکیب میں دراصل مغربی حاکموں کی طرف اشارہ ہے۔)

اقبال نے جہاں جہاں کالونیلزم کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نفسیاتی طریقوں اور حربوں کے جو رُخ ہیں اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جاہل اور اجڈ اور گنواروں کو Civilize کرنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ اپنے اوپر خود حکمرانی کرنے کے قابل ہو

جائیں گے ہم چلے جائیں گے۔آج سو سال بعد ایڈورڈ سعید نے امریکہ اور انگلستان کے ہم اور وہ کے لفظوں کی قلعی اتاری ہے۔مگر اقبال سو سال پہلے ان ظالموں کی قلعی اتار چکے ہیں کہ کس طرح یہ اپنی حکمرانی کے لیے زبان اور کلچر اور سیاست اور اصلاح اور تربیت کے ڈھونگ رچاتے ہیں!

پھر آخری شعر میں محکوموں غلاموں کے دلوں کے تار ہلاتے ہیں کہ تم رنگ و بو اور انسانیت وہی مہذب بنانا جیسے دل آویز نعروں میں کھو گئے ہو۔بھائی یہ نعرے تمھیں غلام بنانے کے انداز ہیں۔اس غلامی کو محکومی کو تو آزادی سمجھتا ہے۔اسی قفس کو تو باغ سمجھ رہا ہے۔

خضرِ راہ۔ جواب خضر

سرمایہ ومحنت

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک!
کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

ویسے تو یہ مزدور اور سرمایہ دار کا ذکر ہے۔ مگر اقبال کے ہاں پتنگا اور جگنو کا ذکر کئی رنگ میں ہوا ہے۔ یہاں بھی باغباں چارہ فرما سے سرمایہ دار مراد ہے مگر اس میں طواف شمع سے آزاد ہو کا قرینہ سرمایہ داری سے آزادی بھی ہے اور سرمایہ داروں کے بھیس میں آئے حکمرانوں کا ذکر بھی ہے۔ جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں جنم لیا اور آخر ہندوستان کے حکمران بن بیٹھے۔ اور ہندوستان کے بزعم خود لیڈران ہی حکمرانوں سے حقوق اور رعایات کے طلب گار ہوئے تو اقبال فرماتے ہیں کہ اس باغبان سے پھولوں کے زخموں یعنی ہندوستان کے لوگوں کی محرومیوں اور مجبوریوں کا علاج نہیں ہوسکتا۔ ان کا علاج تو بہار یعنی مکمل آزادی سے ہی ہوسکتا ہے۔ بہار میں خشک شاخیں بھی ہری ہو جاتی ہیں۔ نئی کونپلیں نکل آتی ہیں، نئے شگوفے شگفتہ ہوتے ہیں۔ یعنی بہار سارے گلستان کے ہر تنکے کو زندگی عطا کرتی ہے۔ اسی طرح مکمل آزادی ہی ہندوستان والوں کے درد کا علاج ہے۔

انسان کی فطرت میں روشنی ہے۔ تجلی ہے۔ آزادی ہے۔ اسی لیے نادانوں تمہیں شمع کے طواف کی ضرورت نہیں۔ یعنی انگریزوں سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں اس سب کے تم خود

وارث ہو۔ علوم کی روشنی تو تمھارے اندر موجود ہے۔ بس بات اتنی ہے کہ خود آگاہی کی ضرورت ہے پھر غیر کی غلامی سے نجات مل جائے گی! بہار مکمل آزادی کا استعارہ ہےاور مرہم رعایات کا استعارہ ہے۔

زخم گل۔ باغبان چارہ فرما۔ بہار۔ تدبیر مرہم۔ کب تلک کرمک ناداں۔ طواف شمع۔ آزادہو۔ اپنی فطرت کے تجلی زار۔ ہزاروں رنگ ہیں اور ہر رنگ میں کئی رنگ ہیں۔

دنیائے اسلام

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ!
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز!
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر!
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

اقبال کا یہ انداز ہے کہ خاص خاص واقعات سے وجوہات، اثرات تلاش کرتے اور پھر علاج تجویز کرتے ہیں جو عمومی رنگ لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبال کا خطاب امت مسلمہ سے ہے اور اہل مشرق سے بھی ہے۔ امت مسلمہ بھی اور مشرق ایشیا والے استبدادیوں کے پنجوں میں گرفتار کراہ رہے تھے بلکہ اب بھی کراہ رہے ہیں مگر اور انداز ہے استبدادیوں کا۔ اب وائسرائے بھیجنے کے بجائے انھوں نے اندر سے ہی کچھ لوگ تلاش کر لیے ہیں جو اُن کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں اور میر جعفر اور میر صادق کی طرح بدنام بھی نہیں ہوتے۔

کلاہ لالہ رنگ سے مراد ایرانی قزلباش ہیں جو کبھی سراپا ناز تھے مگر اب یورپ اور روس نے ایران کو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ آج وہی مجبور نیاز ہیں یعنی غلام ہیں محکوم ہیں۔

حکمت مغرب نے عقل عیار سے کام لے کر ملت یعنی امت مسلمہ کی فطرت سیرت اور

طبیعت ہی کو بدل دیا ہے۔ جس طرح سنار سونے کو گلا کر کبھی کوئی صورت دیتا ہے پھر بدل کو اور صورت دے ڈالتا ہے۔ اسی طرح مغربیوں نے مسلمانوں کی سیرت اور صورت بدل ڈالی ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق اس کو جو بنانا چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔ اور وہ اس رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔

ایک سماجی دانشور کا قول ہے۔

'غیر ملکی حکمران مفتوح اقوام کو اس کی تہذیب و تمدن سے متنفر کر دیتے ہیں اور اپنی تہذیب اس کو دیتے نہیں،' یعنی نہ ہنس بننے دیتے ہیں اور نہ کوار ہنے دیتے ہیں۔ عام لوگ مذاق میں ایسے لوگوں کو کالے انگریز کہتے ہیں اس میں بہت بڑی حقیقت موجود ہے۔ ہم اس قول سے اقبال کی بات کا اثبات نہیں کرنا چاہتے بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال سماجی فلسفی کے طور پر غیر ملکی حکمرانوں کے اثرات کو دیکھ رہے تھے سمجھ رہے تھے اس دور کے ہندوستان میں کوئی دوسرا شاعر یا فلسفی اور سیاسی رہنما اس گہرائی میں نہیں دیکھ سمجھ رہا تھا۔

ملک ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا اسی مصرعے کا دوسرا جز ملت کی آنکھیں کھل گئیں۔ پہلی بات کی تکلیف کو کم کر دیتا ہے۔ مسلمان جو ہندوستان کے حکمران تھے کئی دہائیوں سے وہ علمی عملی زندگی سے دور ہوتے ہوتے آنکھیں موندے خواب غفلت میں سو رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں حکومت چھن جانے پر وہ خواب سے بیدار ہو گئے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ چشم بینا کے ساتھ دل بینا بھی عطا ہو تو دنیا اور اس کے لوازمات کو دیکھ تو غلامی سے آزادی کی راہ نکل سکتی ہے۔ ملک ہاتھوں سے گیا اقبال سے پہلے سر سید احمد خان نے کہا۔ ہندوستان میں سائنسی انداز میں تجزیہ کرنے اور راہ عمل متعین کرنے والی شخصیت۔

پھر اقبال علاج تجویز کرتے ہیں کہ نظم و ضبط ملت بیضا اپنے اندر پیدا کرے تو انگریزوں کی غلامی سے نکل سکتی ہے۔ مسلمان ہی سارے ایشیا کو غیر ملکی حکمرانوں سے آزاد کروا سکتے ہیں۔ اقبال اس کے ساتھ ہی افسوس بھی کرتے ہیں کہ ابھی ایشیا والے اسی نقطے سے بے خبر ہیں۔ مگر اقبال اس بے خبری اور خواب غفلت سے جگانے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں کہ یہ جاگیں اور آزادی کی لگن ان غلاموں کے دل میں پیدا ہو!

طلوعِ اسلام

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ویسے پوری نظم مسلمانوں کے زوال اور پژمردگی کا نوحہ اور عروج کی خواہش سے پُر ہے۔ مشرق کی مردہ رگوں میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس نقطے کو سینا و فارابی نہیں سمجھ سکتے۔ سینا اور فارابی کے فکر و نظر سے ہم نہیں الجھتے۔

دوسرے شعر میں اقبال غلامی کی نفسیات کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی حالت سے نکلنے کے بظاہر دو طریقے ہی نظر آتے ہیں یا تو جنگ سے تلوار سے تیر توپ سے یا پھر فہم سے فراست سے سوچ سے۔ اقبال اس شعر میں غلاموں کے لیے دونوں طریقے ناکافی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں طریق تو ہم پلہ اور ہم مرتبہ آزاد قوموں کے لیے ہوتے ہیں۔

غلاموں کے ہاں تدبیریں صرف تدبیریں ہی رہتی ہیں جس طرح چوہے بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی تدبیریں باندھتے رہتے ہیں۔ غلاموں کے ہاں شمشیر زنی ردِعمل کا جذباتی رنگ غالب کر دیتی ہے اور غلام اس ردِعمل میں شمشیر پکڑ کر غلامی کی دلدل میں اور دھنس جاتے ہیں۔

اقبال ان دونوں تدبیروں اور شمشیروں کو بالکل ناکارہ نہیں کہتے بلکہ غلام قوموں کے

لیے فائدہ مند نہیں سمجھتے ۔اقبال پہلے تو غلاموں کے اندر ذوق یقین پیدا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ غلام بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں یا بدیسی حکمران ان غلاموں کے اندر ہر معاملے میں بے یقینی اور وہم کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کو اقبال واضح کرنا چاہتے ہیں۔ بے یقینی وہ ہتھیار ہے جس سے غیر ملکی حکمران غلام قوموں کی خودی انا اور عزت اور عمل کی قوت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ یقین کی نعمت سے غلاموں کو تہی کر دیتے ہیں۔اور پھر کسی بھی معاملے میں غلاموں کے اندر یقین، اعتماد اور اتحاد پیدا ہونے کے مواقع کم سے کم اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ کالونیلزم کا یہی ظلم ہے جس کو اقبال واضح کر رہے ہیں۔ اگر اس دور کے دونوں طریقے شمشیر والا بھی اور تدبیر والا بھی۔ دیکھیں تو دونوں آزادی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

ذوق یقین پیدا ہو تو پھر تدبیر بھی کارگر اور شمشیر بھی کارگر ہوگی!

غزلیات

○

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے
باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے
تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن بے ہوش ہے

قمری اور بلبل کے ترانے کانوں میں تو پڑ رہے ہیں۔ باطن میں ہنگامے ہیں مگر یہ آباد چمن خاموش ہے۔ اقبال نے رمز و کنایہ سے کام لیا ہے۔ قمری اور بلبل کے ترانے کانوں کو پُر فریب لگتے ہیں مگر دل میں بھی ہل چل پیدا نہیں کرتے۔ ہندوستان کے شاعر اور ادیب زلف و کمر میں الجھے ہوئے ہیں کان تو لطف لے رہے ہیں مگر دلوں میں جو ولولے ہیں ان کو بیدار نہیں کرتے۔ غلام ہندوستان کے باطن میں ہنگامے اور آزادی کی لگن موجود ہے مگر خاموش ہے کیونکہ اس لگن کو بیدار کرنے والے شاعر اور ادیب اور ہی طرح کے نغمے الاپ رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء والے شاعر ادیب بعد میں آئے اور اس گلستاں میں غلام ہندوستان میں آزادی کے گیت گائے۔

دوسرے شعر میں مئے مغرب کے اثر اور اس اثر کے زیر اثر سارے ہندوستان والوں کا بے ہوش ہونا اور ساقی یعنی پلانے والے یعنی انگریز حکمران کی طنزیہ ہنسی کا ذکر ہے۔ غیر ملکی حکمران مفتوح ملکوں میں اس انداز میں اپنا اثر پیدا کرتے ہیں کہ غلاموں کو غلامی ناگوار نہیں

گذرتی۔ چند علما، چند شعرا، چند امرا کو انگریزوں نے اپنی نوازشات سے اپنا غلام تو بنا ہی لیا مگر ان علما، امرا اور شعرا نے پوری قوم کو لوریاں سنا سنا کر سلا دیا۔ غلامی سے نکلنے کی تڑپ پیدا ہونا تو دور کی بات ہے ابھی تو ساری انجمن بے ہوش ہے۔ سارا ہندوستان بے ہوش ہے۔ مغرب کی شراب کے اثر سے۔ اور شراب پلانے والا یعنی ساقی بے ہوش پڑی قوم کو دیکھ کر خندہ زن ہے۔ ایک تلازمہ دوسرے تلازمہ سے ملتا اور نئے تلازموں کو پیدا کرتا جاتا ہے۔ جس طرح انگریزوں نے ایک فریب سے دوسرا فریب اور پھر کئی فریب پیدا کیے۔ اسی طرح اقبال بھی مئے مغرب کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔ اور غلام قوم کے بے ہوش ہونے اور حکمران انگریزوں کی غلاموں کی بے ہوشی پر ہنسی واضح کرتے ہیں۔

○

شیوہء عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناری بت خانۂ ایام ابھی
خبر اقبالؔ کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

تو ہے زناری بت خانہ ایام ابھی سے اقبال واضح کرتے ہیں کہ تیرے دل میں ابھی آزادی کی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ اقبال نے عشق کا لفظ کئی رنگ میں استعمال کیا ہے۔ آزادی، لگن، تڑپ، تگ و دو کوشش، کئی جہتیں ہیں اقبالؔ کے ہاں اس ایک لفظ کی۔ اس شعر میں مرکزی لفظ آزادی ہے۔ جو بت خانہ کی غلامی کے الٹ ہے۔ اقبال غلامی کی ساری جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آریاؤں نے دراوڑوں کو داس بنایا تو اُن کو دیوداس کا خوب صورت لفظ دے دیا۔ یہ دراصل دراوڑوں کے ذہن اور سوچ کو غلام بنانے کا خوب صورت طریقہ تھا۔ دراوڑوں نے اپنی تہذیب کی حفاظت کی اور صدیوں آریاؤں سے لڑتے بھی رہے۔ یہاں اقبال بت خانہ ایام کا زناری بننا کہہ کر حکمرانوں کے اس پر فریب طریقہ کا ذکر کر رہے ہیں۔

کیونکہ حکمران کوشش کرتے ہیں کہ غلام کی فکر آنے والی کل کی فکر نہ کرے۔ صرف آج کی صورت حال پر قانع بھی رہے اور مطمئن بھی رہے اسی طرح غلام کے دل میں آزادی اور دہر آشوبی کے ولولے پیدا نہیں ہوتے۔

آخری شعر میں اقبال گلستاں کے ذکر سے واضح کرتے ہیں کہ وہاں سے آنے والی نسیم یہ خبر لائی ہے کہ نو گرفتار ابھی پھڑکتا ہے۔ دوسرے قیدی تو مطمئن ہیں۔ مگر اقبال، یہاں اقبال نے پھڑکنا کا لفظ رکھ کر شعر کے اندر موجزن جذبے کو ہزار گنا بڑھا دیا ہے۔ اگر اقبال کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو تو شاید تڑپنا کا لفظ رکھ دیتا۔ اسی طرح ایک دوسری کیفیت ظاہر ہوتی۔ مگر اقبال جیسے فکری و فنی حوالوں سے عظیم شاعر سے پھڑکنا ہی کی توقع تھی۔ تڑپنا جس کیفیت کو ظاہر کرتا وہ پھڑکنا سے کوسوں دور اور کم تر ہوتی۔ نو گرفتار، پھڑکنا، تہ دام، گلستاں، نسیم، تمام دلالتیں ہندوستان، غلام ہندوستان، غلام اور اقبال کی اس غلامی کو قبول نہ کرنے کی حالت سامنے آتی ہے۔ اس غلام ہندوستان میں اقبال پھڑک رہا ہے یہ یاد رہے تڑپ نہیں رہا۔ پھڑک رہا ہے۔ اقبال کے آخری دنوں میں ۱۹۳۶ء والے آ گئے۔ اور آزادی کے گن گائے۔

ہم اُن کے فن اور فکر کا جائزہ نہیں لے سکتے مگر یہ سچ ہے کہ ترانے انھوں نے گائے۔

○

تہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی

یہاں اقبال غلام قوموں کی دلی اور ظاہری کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ آزادی کی لگن آزادی کے ترانے جب تک لبوں پر واشگاف نہ آئیں اور زیر لب جاپ ہوتے رہیں تو غلام قوم کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ غلام ملکوں، غلام قوموں اور غلام خطوں میں یہی ہوتا ہے کہ غلام زیر لب تو غلامی سے نفرت کرنے اور آزادی کی خواہش کرتے ہیں مگر دہر میں پیمانہ اسی کا ہے جو بڑھ کر اٹھا لیتا ہے۔ اس کے لیے صرف دلوں کی تڑپ کام نہیں دیتی جب تک یہ تڑپ

اگلی منزل پر نہ آئے۔ وہی منزل آزادی کا استعارہ ہے۔ وہ منزل بلند آواز میں غزل سرائی ہے۔ زیرلب یا دل میں مالا جپنے سے قیدی آزاد نہیں ہوسکتا۔ آزادی کے لیے پنجرے کو توڑنا پڑتا ہے۔ فغاں دلوں میں تڑپتی ہے۔ زیرلب جاپ ہوتے رہیں۔ تہ دام غزل سرائی ہوتی رہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ غلام کے کسی کام نہیں آتے۔ اسی تڑپ کو پھڑک بننا چاہیے۔ زیرلب کو بلند ہونا چاہیے۔ تاکہ اس آواز کو سن کر دوسرے بھی آزادی کا ترانا گائیں اور اس طرح سب قیدی مل کر آزادی کے گیت گائیں تو پھر یہ ترانے عملی جدوجہد کی صورت میں بدل جائیں گے تو غلام قوم غلامی سے نکلنے کی جدوجہد شروع کرے گی!

○

گرچہ تو زندانی اسباب ہے
قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

ظاہر ہے اسباب کے بغیر کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا اور انسان اسباب کا قیدی رہتا ہے۔ مگر ایسا انسان جب اپنے دل کو قید سے آزاد رکھتا ہے تو پھر آزادی کے لیے اسباب بھی مہیا ہو ہی جاتے ہیں۔ اقبال دلوں میں آزادی کی لگن زندہ رکھنے کا کہتے ہیں جب دل آزاد رہے گا روح آزاد ہوگی تو ایک دن جسم اور وطن بھی آزاد ہوں گے۔

ظریفانہ

○

تعلیمِ مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے' بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال' بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم' دیکھ! مرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور!
اچھی ہے گائے، رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

اس نظم کے چار اشعار میں غلام قوموں کے اخلاق و خصائل کا ذکر کیا ہے۔ پہلے شعر میں غلام قوموں کو غیر ملکی آقاؤں کی طرف سے دی جانے والی تعلیم کے اثرات کا ذکر ہے۔ یہاں پھر وہی بات ہے کہ حکمرانوں نے خالص علوم یعنی سائنس اور نیچرل سائنس یا سوشل سائنس کے مضامین نہیں پڑھائے بلکہ لٹریچر اور آرٹس کے مضامین اور وہ بھی اپنی مرضی کے شاعر ادیب شامل کیے۔ جنھوں نے سائنسی فکر پروان نہ چڑھنے دی بلکہ صرف جذباتی اور نفسیاتی الجھنیں پیدا کیں۔ جس کے عمل اور ردعمل میں ایک طبقہ مکمل نقال بن گیا اور دوسرا طبقہ مکمل نقاد۔ یہاں نقاد دشمن کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

دوسرے شعر میں انگریز حکمرانوں نے کس طرح ہندوستان جو انگریزوں کے آنے سے

پہلے کئی صنعتوں میں اور پیشوں میں عروج پر تھا۔ان صنعتوں اور کارخانوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ہندوستان کو صرف اور صرف زرعی ملک بنا دیا اور صنعتی طور پر پسماندہ کر کے صرف اور صرف خریدار بنا دیا۔ یہ معاشیات کا کلیہ ہے کہ جو ملک خریدار ہوتے ہیں وہ غریب اور پسماندہ رہتے ہیں اور جو صنعت و حرفت میں ترقی کرتے ہیں وہ ایکسپورٹر بن کر امیر اور ترقی یافتہ بن جاتے ہیں۔انگریزوں نے یہاں کے عوام کو غلام بنا کر اِن سے ہنر چھین کر ان کو اپاہج بنا دیا۔اس طرح ہندوستان کی دولت لوٹ کر لے گئے۔ ہندوستان کو اتنا پسماندہ بنا دیا گیا کہ افغانستان سے آغا بھی ہینگ بیچنے کے لیے ہندوستان آ گئے۔

تیسرے شعر میں ہندوستان کے طبقہ امرا کا ذکر ہے جو انگریزوں کے غلامی کو ماتھے کا جھومر سمجھتا تھا۔اُن کے تلوے چاٹتا تھا۔ یہ تلوے چاٹنے کے لیے بوٹ چاٹنے کے لیے ان کے پاؤں پڑتا تھا اور انگریز ان غلاموں کو دھتکارتے تھے کہ تمھارے رینگنے سے ہمارا فرش خراب ہو رہا ہے۔ اقبال نے غلام قوموں کے اخلاق کس طرح تباہ ہو جاتے ہیں۔اس کی تصویر دکھائی ہے اور غیر ملکی قابض اور فاتحین کس طرح نازنخرے کرتے ہیں وہ بھی واضح کیا ہے۔غلام قوموں کی فطرت کتنی پست اور گھٹیا بن جاتی ہے۔اقبال نے بیان کر دیا۔

آخری شعر میں ہندو کو گائے اور مسلمان کو اونٹ کے استعارے میں بیان کیا ہے۔ مسلمان تو اونٹ کی طرح سیدھے ہیں اور اُن پر جو لاد دیں اٹھا لیتے ہیں۔البتہ ہندو گائے کی طرح جو کڑیاں بھر لیتے ہیں اور نوک دار سینگوں سے احتجاج بھی کر لیتے ہیں۔مگر گائے دودھ تو انگریزوں کو دے رہی ہے۔ مطلب یہ کہ دونوں ہندو اور مسلمان انگریزوں کی فرماں برداری کر رہے ہیں مگر انگریز ہندوؤں پر مہربان ہیں اور مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں!اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے حکمرانی مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے تھے۔

○

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟
دفعِ مرض کے واسطے بل پیش کیجیے!
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیہء دل پیش کیجیے!
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ ''بل پیش کیجیے''!

کسی طرح بدیسی حکمران محکوم اقوام کے طور طریقوں اور سماج کے بندھنوں کو بدل دیتے ہیں۔ بے رنگ کر دیتے ہیں۔ پھر بات کو دہرانا پڑتا ہے کہ محکوم کو اس کی اپنی تہذیب سے جدا کر دیتے ہیں اور حاکم اپنی تہذیب اس کو دیتے نہیں۔

تہذیب کے مریض، گولی، بل، اقبال نے کوئے کو ہنس کی چال چلتے دکھایا ہے۔ تمام بیماریوں سے بڑی بیماری ذہنی طور پر غلام ہو جانا ہے۔ ایسے افراد اور سماج جو اپنی تہذیب کو کم تر جاننے لگیں اپنی زبان اپنے لباس کو حقیر سمجھنے لگیں آقاؤں کی نقالی شروع کر دیں۔ اپنی زبان چھوڑ دیں اور آقاؤں کی زبان پوری طرح نہیں نقالوں کی طرح اپنالی۔

ہمارے اسلامی اور مشرقی سماج کے اندر استاد کی عزت اُس کے خدمت ملت کے جذبے کی وجہ سے تھی۔ انگریزوں نے پہلے تو استاد کو خدمت کے جذبے سے محروم کیا اور پھر طلبا کے دل سے استاد کا احترام خود بخود نکل گیا۔ ہمارے اسلامی مزاج میں تو استاد کے لیے دل و جان قربان تھے مگر آج حکمرانوں نے استاد کی خدمت کا مول چند روپے کر دیا ہے۔ دراصل اقبال استاد اور شاگرد کے درمیان جو دلی اور ذہنی ہم آہنگی تھی اسی کے ختم ہو جانے پر کڑھتے ہیں۔ اسلامی سماج میں اس ادارے کی جو عزت اور شان تھی اس کے زوال اس طرح ہوا ہے کہ اب طلبا ٹیوشن فیس ہی استاد کی خدمت کا صلہ سمجھتے ہیں۔ غیر ملکی حکمران یہی کرتے ہیں کہ محکوم قوموں کے اداروں

کو بے توقیر بنا دیتے ہیں۔ اس طرح محکوم قوم اپنے اداروں سے بددل ہوکر بدیسی حکمرانوں کے اداروں کی دریوزہ گری کرنے لگتی ہیں۔ اور پھر غلام آہستہ آہستہ اس دریوزہ گری کو اپنی شان سمجھنے لگتے ہیں۔

○

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

ان دو شعروں میں بھی محکوم اور غلام قوموں کی معاشی ابتری کا ذکر ہے۔ جب ان سے تخلیقی قوت چھن جاتی ہے۔ یہ بڑا اہم نقطہ ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوموں سے اُن کی تخلیق قوت چھین لیتی ہے۔ ختم کر دیتی ہے۔ برباد کر دیتی ہے۔ تباہ کر دیتی ہے۔ اُن کو صرف اور صرف نقال بنا دیتی ہے۔ ان کے ذہنوں سے تخلیقی اپج اور اختراعی قوت سلب کر لیتی ہے۔ اس طرح مفتوح ملک کی رعایا اپاہج بن جاتی ہے۔ ان کے ذہن تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف خریدار رہ جاتے ہیں۔ وہ خود کوئی چیز بنا کر تخلیق کر کے بیچ نہیں سکتے۔

معاشیات کا مدار اسی نقطہ پر ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ زندگی کی ضرورت کی حقیر سے حقیر چیز کے لیے بھی ہندوستان کے غلام عوام دوسروں کے مرہون منت ہیں اور اگر یہی غفلت کچھ دیر اور قائم رہی تو ہمارے ہندوستان کے لوگوں کو غسل دینے کے لیے قابل سے غسال آئیں گے اور کفن Made in Japan ہوگا۔

O

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے' ہاں! باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں؟
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے' دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے' یا قربانی یا جھٹکا ہے

ان چار اشعار میں اقبال نے کئی ایک نقاط کو واضح کیا ہے۔ ہمیشہ فاتح قوم کی تہذیب اور تمدن مفتوح قوم پر غالب آ جاتے ہیں کیونکہ اکثر فاتح وہی ہوتا ہے جو علم وادب و سائنس اور دوسرے علوم اور تہذیب وتمدن میں برتر ہوتا ہے۔ جس کے پاس آلاتِ ضرب وحرب مفتوح اقوام سے زیادہ جدید ہوتے ہیں۔ اقبال اسی نقطے کو بیان کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے دل انگریزوں کی چمکتی دمکتی تہذیب میں جا اٹکا ہے۔ یہاں جا اٹکا کی ترکیب رکھ کر اقبال اسی کو بے وقوفی اور ناسمجھی قرار دیتے ہیں۔ اور دوسرے مصرعے میں مٹکا کا لفظ رکھ کر ہندوستان کے تمدن کا ذکر کرتے ہیں۔ دو تمدنوں کا فرق بھی واضح کر رہے ہیں کہ وہاں سب کچھ بلور کی طرح چمکدار اور مٹکا میں چمک تو نہیں مگر دھرتی کے ساتھ جڑت کا اظہار ہوتا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ وہی باقی رہے گا جس کا اندرون اپنی دھرتی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ جو اپنے دین پر کاربند رہے گا۔ اور ہٹ کا پکا ہوگا یعنی بے یقینی کا شکار نہ ہوگا۔ ذوق یقیں اس میں رہے گا۔

تیسرے شعر میں شیخ و برہمن کو کہتے ہیں کہ سنو اہل بصیرت کیا کہتے ہیں۔ اس مصرعے

میں شیخ و برہمن کو بصیرت سے فارغ قرار دیتے ہیں۔ شیخ و برہمن سے کہتے ہیں کہ اہل بصیرت کے فرمان غور سے سنو کہ ہندوستان کے غلام بن جانے کے کیا اسباب ہیں۔ آخری شعر میں ہندی اور اردو کے جھگڑے اور جھٹکے اور ذبح سے تنازعات جو شیخ و برہمن نے ہندوستان میں پیدا کیے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ دراصل اردو اور ہندی کا جھگڑا بھی انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑانے کے لیے خود پیدا کیا۔ اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کے لیے جھٹکا اور قربانی کا جھگڑا بھی انگریزوں نے پیدا کیا انگریز اپنی مکاری اور عیاری سے ان دونوں کو لڑاتے بھی رہے اور صلح کروانے کی ظاہری کوشش بھی کرتے رہے۔

غلام اور محکوم ملکوں میں فاتح حملہ آور یہی کرتے ہیں کہ ان میں نفاق اور افتراق پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کی حاکمیت دیرپا اور پائیدار بن پاتی ہے۔ محکوم اقوام میں کچھ ایسے افراد اور گروہ پیدا کر لیتے ہیں جو اُن کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح غلام قومیں آہستہ آہستہ اس غلامی کو قبول کر لیتی ہیں اور ان غیر ملکوں آقاؤں سے اپنے فیصلے [illegible]تے ہیں۔ اقبال نے ہم مشرق اور مغرب کے مکین کہہ کر غلام اور آقا کا ذکر کیا ہے۔ اقبال نے کون سا انداز استبدادیوں کا عیاں نہیں کیا ہے! ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف انگریزوں کے دور میں بڑھتے ہی بڑھتے گئے۔

O

ہندوستاں میں جزوِ حکومت ہیں کونسلیں
آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا
سیکھیں سلیقہ اب امرا بھی ''سوال'' کا

انگریزوں یعنی غیر ملکی حاکموں نے ہندوستان کی غلام اور محکوم اقوام کو سوال کا حق دیا تھا۔ اندازہ کریں کہ کونسل کے ممبر تو مقامی غلام باشندوں کو بنالیا گیا مگر اُن کو حکومتی پالیسی میں دخل

دینے کی اجازت نہ تھی۔ حکومتی پالیسی بناتے ہوئے انگریز حکمرانوں ہی کا حکم پالیسی کا درجہ اختیار کر لیتا۔ ممبر یعنی غلام اقوام کے افراد کو صرف اور صرف کسی معاملے یا پالیسی کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت تھی۔ گورنر یا ادارے کا چیئرپرسن اس سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں تھا۔ اس سے اس کی عزت توقیر اور مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی آقاؤں کے سامنے ممبر کی کیا حیثیت تھی۔ دوسرے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ ہم یعنی عام لوگ تو پہلے ہی فقیر تھے۔ مگر اب امرا بھی بڑے لوگ بھی سوال کرنے کا سلیقہ سیکھ جائیں گے یعنی اب یہ بھی ہم فقیروں یعنی عوام جیسے ہیں۔ یہاں اقبال ایسے افراد کا ذکر کرتے ہیں جو غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے تو بے توقیر ہیں مگر مقامی رعایا کے سامنے حکمرانوں کے قریب سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح اقبال غیر ملکی حکمرانوں کی رعایات اور حقوق جو وہ مقامی غلاموں کو عطا کرتے ہیں وہ بھی مقامی غلام بڑی عزت سمجھتے ہیں۔ جس طرح اسمبلی میں مقامی غلام ممبروں کو صرف سوال کا حق دیا گیا۔ اور چیئرپرسن جو کہ غیر ملکی آقا تھا وہ جواب دینے کا پابند نہیں تھا۔ اس طرح اقبال نے غلاموں کی سیاسی غلامی کی نفسیات کا اظہار کیا ہے۔ مرکزی یعنی وائسرائے کی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں یعنی گورنرز کی اسمبلیوں میں مقامی آج کی زبان میں ایم این اے اور ایم پی اے کو صرف سوال کرنے کی اجازت تھی۔ مگر ہندوستانی عوام پر انگریزوں کے یہ غلام کالے انگریز ہی تھے۔

○

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے، بجا فرما گئے
''ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟''

مرکزی امپیریل کونسل کی ممبری کی خواہش مقامی محکوم اقوام کے بڑوں کے لیے بڑی

کشش رکھتی تھی۔ یہ امپریل کونسل وائسرائے کو صرف اور صرف مشورہ دے سکتی تھی۔ ہندوستان کے عوام کے مفاد یا بہتری کے لیے کوئی پالیسی وضع نہیں کر سکتی تھی۔ اسی کونسل میں محکوم خطے کے لیڈروں کو سوال کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ اور وائسرائے ان غلاموں محکوموں کے سوال کے جوابات دینے کا پابند نہ تھا۔ اسی طرح ان غلام اقوام ہندو اور مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے ممبروں کو مشورہ دینے کی ہی آزادی تھی۔ کالونیوں پر قابض حکمرانوں کا محکوموں پر یہ احسان بھی بہت بڑا احسان تھا کہ وہ سوال کر سکتے ہیں۔ وہ مشورہ دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد انگریز حکمرانوں کی مرضی کہ مشورہ کو رد کر دیں۔ سوال کو درخور اعتنا سمجھیں نہ سمجھیں۔ یہ غلام ممبران سوال کی آزادی اور مشورہ دینے کی اجازت پر ہی نازاں تھے اور جب اپنی غلام عوام کے سامنے آتے تو سر فخر سے بلند کر لیتے کہ حکمرانوں سے ان کے مراسم ہیں۔

یہ کونسل اسی دلی میں تھی جس میں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے خون کی ندیاں بہائی تھیں۔ اور حریت پسندوں کو پھانسیوں پر لٹکا دیا تھا۔ جب پھانسی گھاٹ کم پڑ گئے تو درختوں کو پھانسی گھاٹ بنالیا تھا۔ اقبال نے غالب کا مصرعہ رکھ کر تلازمات خیال کو پیچھے کی طرف دوڑایا ہے۔ اور اس ایک مصرعے سے سیکڑوں ظلم کی داستانیں ابھرنے لگتی ہیں۔ اس مصرعے میں امپریل کونسل کے ممبروں کی شکم پروری کی طرف بھی خیال جاتا ہے۔ مغلوب اقوام کے لیڈران کونسلوں کی ممبری کے ذریعے اپنی شکم پروری کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی ترقی اور آزادی ان کا مطمع نظر نہیں ہے! دوسری جنگ عظیم اور دوسرے واقعات نے محکوموں کی آزادی کی راہ ہموار کر دی۔

○

دلیل مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
نہ ہو حضور سے الفت، تو یہ ستم نہ سہیں
مصر ہے حلقہ، کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی
مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجئے لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب' پھر رہیں' رہیں نہ رہیں
زمیں پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی
مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تہیں
مثالِ کشتیٔ بے حس مطیعِ فرماں ہیں
کہو تو بستۂ ساحل رہیں' کہو تو بہیں

ان اشعار میں اقبال نے غلام خطوں کے عوام کے سیاسی رہنماؤں کی نفسیات اور اخلاق واضح کیے ہیں۔ دنیا میں کالونیلزم کے دور پر افسانے ناول ڈرامے لکھے گئے۔ مؤرخین نے حکمرانوں کے ظلم موضوع سخن بنائے ہیں۔ تہذیبی تاریخ لکھنے والوں نے بھی نفسیات دانوں نے بھی غلام اقوام کی نفسیات اور اخلاقیات پر بہت کچھ لکھا۔ اقبال نے بھی محکوم اقوام کے اخلاق ونفسیات پر مخصوص ٹرمنالوجی سے ہٹ کر کئی بار بلکہ بار بار اظہار خیال کیا ہے۔ مذہب پر، سیاست پر، معیشت پر، غرض کہ کوئی پہلو اقبال کے ہاں سے غائب نہیں ہے۔ اقبال کی فکر تمام رخ عیاں کرتی ہے۔ اوران کے اثرات اور نتائج بھی واضح کرتی ہے۔ ان اشعار میں سیاسی بزرگوں کی سائیکی اور کم ظرفی اور ذاتی مطلب پرستی نظر آتی ہے۔

پہلے شعر میں محکوموں کے لیڈروں کی پہلی بڑی کمزوری واضح کی ہے کہ ان محکوم اقوام کے

سیاسی لیڈروں کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ غیر ملکی حکمران ان پر نظر کرم کریں اس کے لیے انھیں جو بھی ظلم اور زیادتیاں سہنا پڑیں سہہ لیتے ہیں۔ وہ حکمرانوں کی نظرِ عنایت اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے پست سے پست سطح تک گرنے میں بھی اپنی بڑائی سمجھتے ہیں۔ انگریزوں سے وفاداری میں ان کے سب ظلم سہہ رہے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ ان کی وفاداری پر انگریز یقین کرلیں۔

دوسرے شعر میں ان سیاسی لیڈروں کی کم ظرفی اور ذلالت کا اظہار ہے۔ ویسے تو یہ عوامی نمائندے کا روپ دھار کر منتخب ہو کر کمیٹی کونسل کے ممبر بن گئے ہیں۔ اب محکوم عوام خواہش کرتے ہیں کہ کمیٹی میں ان کے حق میں آواز اٹھائی جائے۔ مگر ان کمیٹی ممبران میں اتنی اخلاقی جرات وحمیت نہیں ہے کہ وہ کچھ کمیٹی اجلاس میں بولیں۔ یہ غلام اقوام کے رہنما کلکٹر کی طرف دیکھتے ہیں کہ اس کے اشارہ ابرو اجازت مرحمت فرمائیں تو بولیں اور اگر تیور چڑھے ہوں تو اسی تنخواہ پر خاموش رہیں۔ امپریل کونسل یعنی مرکزی کونسل کا چیئرپرسن تو وائسرائے ہوتا ہے۔ اور کمیٹی کونسل کا چیئرپرسن کلکٹر ضلع ہوتا ہے۔ امپریل کونسل کے غلام ممبران وائسرائے کے سامنے دست بستہ ہیں اور کمیٹی کونسل کے ممبران کلکٹر کے سامنے سرخم خاموش ہیں۔ (کلکٹر جو کہ ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا صوبے کے نیچے مقامی حکومتیں)

تیسرے شعر میں کمیٹی ممبران کی اخلاقی گراوٹ اور پستی کا ذکر ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ان غلام ممبران کی کوشش ہوتی ہے کہ انگریز ان کو اپنا وفادار سمجھ کر ایک سند عطا فرمادیں تاکہ ان کی آئندہ نسلیں آئندہ کے انگریز حکمرانوں کو دکھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلا کر کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل کرسکیں۔ دوسرے مصرعے میں غیر ملکی حکمرانوں کے مزاج کی متحرک تصویر سامنے آتی ہے۔ ان انگریز حکمران کے مزاج کا کیا اعتبار اب مہرباں اگلے لمحے دھتکار دیں۔ اس شعر میں پستی اور بلندی نظر آتی ہے۔ کچلی ہوئی انا والے اور بے جا ناز کرنے والے سامنے آتے ہیں۔ سینکڑوں صفحوں میں یہ مضمون بیان کیا جاسکتا ہے جس کو اقبال نے چند شعروں میں بیان کردیا ہے۔

چوتھے شعر میں بے سروسامانی، بے بسی، مجبوری ہے۔ زمین پر تو ہندوستان والوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ سمندروں کی تہہ ان کے لے خالی ہے۔ اس سے زیادہ شدید دکھ اور کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

آخری شعر میں پھر پہلے شعر والی بات انداز بدل کر کہی ہے۔ کشتی بے حس کا استعارہ ہندوستانی عوام، لیڈر سب کے لیے ہیں کہ یہ احساسات سے عاری ہو چکے ہیں۔ ان کے ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ ان کے دل خودی اور انا سے عاری ہو چکے ہیں۔ غیر ملکی آقا ان کو جو حکم دیں وہ کر گزرتے ہیں۔ اپنی فکر، اپنی سوچ سے یہ کوئی عمل نہیں کرتے بلکہ اشیا کی طرح بن چکے ہیں۔ جیسے اشیا بے حس ہوتی ہیں اسی طرح یہ لکڑی کی کشتی کی طرح ہیں ان کا ملاح انگریز ہے۔ وہ چاہے تو ساحل پر کھڑا کردے اور چاہے تو سمندر میں رواں کر دے۔

کہو تو بہیں کی ترکیب کسی چیز کے بہہ جانے۔ ڈوب جانے کی طرف خیال کو لے جاتی ہے۔ اگر تم کہو تو ہم بہہ جانے، غرق ہو جانے پر بھی تیار ہیں آپ کے حکم کا انتظار ہے۔

○

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرمِ سخن
نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسی اپنی
سنتی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار
ہند میں آپ تو ازروئے سیاست ہیں اہم
ریل چلنے سے مگر دشتِ عرب میں بیکار
کل تلک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صدائے زنہار

آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
نہ رہا آئنہ دل میں وہ دیرینہ غبار
جب یہ تقریر سنی، اونٹ نے شرما کے کہا
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار
رشکِ صد غمزۂ اشتر ہے تری ایک کلیل
ہم تو ہیں ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار
ترے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاقِ گفتار
ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیرا اپنا
گرچہ کچھ پاس نہیں، چارا بھی کھاتے ہیں ادھار
گوسفند و شتر و گاو پلنگ و خرلنگ
ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار
باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا
ہم زباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیورِ گلزار
دے وہی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی
تو بھی سرشار ہو، تیرے رفقا بھی سرشار
"دلق حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن
وانگہش مست و خراب از رہِ بازار بیار"

گائے یعنی ہندو اور اونٹ یعنی مسلمان سے یوں ہم کلام ہوئی کہ میں تو رسی تڑا کر بدنام ہوئی میں نے سنا ہے کہ آپ نے بھی مہار توڑ دی ہے۔ ہند میں تو تمھاری مسلمانوں کی سیاست میں بڑی اہمیت ہے۔ عرب میں ریل کے چلنے سے یعنی انگریزوں کی مداخلت سے مسلمان بیکار ہیں۔ اور کل تلک تم مسلمان ہم سے دور بھاگتے تھے۔

جواب میں اونٹ یعنی مسلمان نے کہا ہم تو تمھارے پرانے چاہنے والے ہیں اور تمھارے ہنگاموں سے جنگل میں یعنی ہندوستان میں اب بے زبان قومیں بھی بات کرنے لگی ہیں۔ایک مدت سے ۱۹۴۷ء سے ہم اور تم اس دیش میں اکٹھے رہ رہے ہیں۔ بے شک آج ہم قلاش ہو چکے ہیں اور روٹی بھی ادھار لے کر پیٹ میں ڈالتے ہیں۔

بکری، اونٹ، گائے، چیتا اور لنگڑا گدھا ہم زبان ہوں تو اپنا وقار بحال کر سکتے ہیں۔

جب باغباں باغ کا رکھوالا یعنی انگریز ہم سب کو ایک رنگ میں رنگنا چاہتا ہے تو پھر باغ کے پرندوں یعنی ہندوستان کے باسیوں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی سب ہم زباں ہو کر کیوں نہ گائیں۔

وہی شراب یعنی گائیڈ لائن ہمارے لیے جو تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے لیے ہے۔

تو پھر کیوں نہ تم بھی اور ہم بھی اسی گائیڈ لائن کو سیاسی نعرہ بنا کر الاپنے لگیں۔

حافظ کی گدڑی کس کام کی اس کو شراب میں ڈبو کر رنگین کر لو۔ مست اور خراب سر بازار۔

غلام اقوام کس طرح اور کن احوال اور کس مزاج کی بن جاتی ہیں اقبال نے استعاروں میں واضح کر دیا۔ گائے کی کلیل، گائے کی رسی، اونٹ کے لٹکے ہونٹ، اونٹ کی مہار، رشک صد غمزہ اشتر، تری ایک کلیل، ہم تو ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار، ایک ہی بن، گوسفند، شتر، گا، پلنگ و خرلنگ، باغباں جو سبق آموز ہو یک رنگی کا، ہمزباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیور گلزار، دلق حافظ، مست و خراب، میں کیا کیا اقبال نے بیان کر دیا ہے۔ حکمرانوں اور غیر ملکی حکمرانوں کا طریقہ حکمرانی۔ نفاق ڈالنا۔ ساری کی ساری اقوام اور عوام کو ایک رنگ غلامی میں رنگ دینا۔ محکوم اقوام کو ایک گھاٹ پر پانی پلانا۔ سب کو ایک نعرہ دینا جس کو سب کے سب کا یک زبان ہو کر بے سوچے سمجھے الاپتے رہیں۔ ایسی شراب غیر ملکی آقا پلا دیتے ہیں کہ اس میں مست حال اور خراب حال سر بازار آنا اور اپنی مست حالی پر اترانا۔

حکمرانوں کے طریقہ حکمرانی جو کالونیل پیریڈ میں تھا۔ اس کو اقبال نے جس طرح بیان کیا ہے۔ وہ اقبال جیسے عظیم شاعر، فلسفی، نفسیات داں اور مورخ ہی کے بس کی بات ہے۔

○

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

غیر ملکی حکمران کس طرح مفتوح اقوام سے اُن کا مذہب اُن کی تہذیب چھین لیتے ہیں۔ مفتوح اقوام کے انداز حکمرانی کو کس طرح مردود قرار دے دیتے ہیں۔ مفتوح اقوام کس طرح حاکم قوم کی چیزوں طریقوں کو اچھا سمجھتے اور ان سے مرعوب ہو کر ان کے غلام ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے مفتوح اقوام کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ اور ساتھ ہی نفسیاتی حوالے سے احساس کمتری میں مبتلا اقوام کو الیکشن، ممبری، کونسل جیسے اداروں کی حقیقت بھی بتا دی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ہندوستان کو غلام رکھنے کے لیے الیکشن، ممبری اور کونسل کو آزادی کی نیلم پری بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر دراصل یہ پھندے ہیں جن میں پھنس کر محکوم اقوام ذہنی طور پر اس غلامی کو قبول کر لے گی۔ دراصل پرانے سیاسی اداروں کو انگریزوں نے تباہ کرنے کے لیے اور ہندوستان کے غلاموں کے ذہنوں سے محو کرنے کے لیے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اُن کے ماضی سے کاٹنے کے لیے ایک نیا نظام سیاست متعارف کروایا۔ اور محکوم صرف سوال کرنے کی آزادی اور مشورہ دینے کی اجازت ہی کو آزادی سمجھنے لگے۔ اقبال خوب جانتے تھے کہ مفتوح اقوام کو اگر اِن کے ماضی سے منقطع کر دیا جائے تو ان کو جدھر دل چاہے موڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے اقبال ان کو نئی تہذیب کہہ کر رد کرتے ہیں۔ اقبال جانتے تھے کہ اگر مسلمان اپنے ماضی سے الگ ہو گئے تو ان کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

یورپ کے رندے سے بڑے تیز ہیں۔آخری شعر میں اقبال یورپ کی عقلی عیاریوں اور چالاکیوں اور تیزیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بڑھئی جن رندوں سے لکڑی کو چھیل رہا تھا ان ہی رندوں سے بڑھئی بھی چھل گیا۔جس فکراور سوچ سے یورپ والے مراد انگریز حکمران کام لے کرایک نئی تہذیب اور نیا فلسفہ سیاست متعارف کروار ہے تھےاور اس کے لیے جن لوگوں یعنی مقامی لیڈروں سے کام لے رہے تھے جو یورپیوں کے فکراور سوچ کو ہندوستان پر لاگو کرنے کے لیے اُن کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔وہ خود بھی چھیلے گئے۔وہ بھی اپنی تہذیب،اپنی فکر،اپنی روایت،اپنی سیاست سے دور ہو گئے۔اور یورپ ہی کے رنگ میں رنگے گئے۔یہ وہی لوگ ہیں جن کو عوام کالے انگریز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔(یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں بلدیاتی نظام سرے سے موجود ہی نہ تھا)

غزلیات

○

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن ' تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

غالب نے کہا تھا۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبال نے بھی ان ہی علائم و رموز سے مذہب سیاست غرض کہ تمام شاعری میں کام لیا ہے۔ وہی مقام جو آزادی کا تھا۔ خود اختیاری و خود مختاری کا تھا۔ اب ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ وہی کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کیا جا سکے۔

تین سو سال ہوئے ہند کی تخلیقی قوت سلب ہو چکی ہے اور تخلیقی قوت تب سلب ہوتی ہے جب ذہن اور دل نکمے ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکی حکمران سب سے پہلے یہی کام کرتے ہیں کہ

مفتوح اقوام کے دل ودماغ کے سوتے خشک کرتے ہیں اسی طرح مفتوح اقوام تخلیقی واختراعی قوت جس پر زندگی اور نُمو کا انحصار ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال اسی تخلیقی قوت کے چھن جانے اور انگریزوں کی غلامی کا ذکر کرتے ہیں اور دوبارہ اپنے بادہ وساغر کو حرکت میں لانا چاہتے ہیں جو اپنا تہذیبی واسلامی ورثہ ہے اس کی بحالی کی خواہش اور تمنا جھلملاتی نظر آتی ہے۔

تیسرے شعر میں پھر غلاموں کے دل ودماغ کو ہلاتے ہیں کہ تمھاری تیغ جگر دار کہاں کھو گئی ہے۔ اور تمھارا علم کدھر گیا ہے۔ زندگی میں نمو علم اور عمل کے سبب قائم رہتی ہے۔ اگر ایک بھی ان میں نہ ہو تو زندگی میں نمو کم ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ علم ذہن کے اعصاب کو مسلسل عمل میں رکھتا ہے۔ اور دنیا اور زمانے کے تقاضوں کو اپنے سے ہم آہنگ کرتا ہے یا اپنے آپ کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا رہتا ہے۔ یہی زمانے میں زندہ قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ عشق اقبال کے ہاں جدوجہد مسلسل کوشش وکاوش کا استعارہ ہے۔ علم اور عشق دونوں باہم شیروشکر ہوتے ہیں تو زندگی میں شیرینی اور لطف پیدا ہوتا ہے۔ اقبال یہاں غلاموں کے ان ہی سے یعنی علم اور عمل سے تہی دامن ہونے کا اظہار فرماتے ہیں۔ آخری شعر میں اقبال نے بڑی اہم بات کہی ہے۔ غلام اقوام کا عمل بھی کوئی مثبت نتائج پیدا نہیں کرتا۔

حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

غلاموں کی حرکت تو تیز تیز نظر آتی ہے مگر ان کا باطن ان کا ذہن ان کا دل روشن نہیں ہوتا۔ غلاموں کی حرکت کولہو کے بیل کی طرح متعین راستوں پر سفر کرتی ہے۔ جس میں انھیں نہ منزل کا علم ہوتا ہے نہ منزل کا تعین ہوتا ہے۔ بس ایک بیگار وہ کرتے ہیں۔ محکوم اقوام میں آزادی کے نعرہ لگانے والے۔ بلند آواز میں بولنے والے۔ احتجاج کرنے والے تو سینکڑوں ہزاروں نظر آتے ہیں مگر یہ تمام جذبے کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ محکوم اقوام میں کوئی ایک ہی فکر اور راست فکر کے ساتھ راست قدم اٹھاتا ہے۔ اگر سیاسی نفسیات کا ذکر کیا جائے تو غیر ملکی حکمران نان ایشوز پالیٹکس میں غلاموں کو الجھائے رکھتے ہیں۔ اس طرح غلاموں کے اندر جو تھوڑا بہت جذبہ ہوتا ہے وہ بھی احتجاجوں کی نظر ہو جاتا ہے اس طرح غلام کسی ٹھوس فکر کو بنیاد نہیں بناتے اس طرح جذباتی اور احتجاجی لیڈر جو سوزِ سخن کے عادی ہوتے ہیں دراصل غیر ملکی

آقاؤں کا کام آسان کر دیتے ہیں۔ غلاموں کے اندر جو جذبہ ہوتا ہے احتجاجوں اور تقریروں کے ذریعے اس کا کتھارسز کر دیتے ہیں۔ اس طرح حکمرانوں کو محکوموں سے بغاوت کا خطرہ نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے یہی حربہ آزمایا۔ گلی گلی محلے محلے مرگ دوام طاری کرنے والے نعرہ باز لیڈر پیدا ہو گئے۔ چونکہ ان غلاموں کا سینہ دل اور دماغ روشن نہ تھا۔ وہ فلسفیانہ سطح سے اس غلامی اور اس کے اثرات کو نہیں دیکھ رہے تھے اسی وجہ سے بقول اقبال ان کے سخن مفتوح اقوام پر مرگ دوام طاری کرنے والے ہیں۔ ان اشعار میں اقبال نے سیاسی فلسفہ اور غلامی کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔

جب تک علم نہ ہوگا اور اس کے بعد عمل نہ ہوگا۔ سارا شور و غوغا ہی ہوگا۔ علم اور عمل جس میں ذوق یقین اور سوز دروں ہو تو تب ہی کوئی غلاموں کے حق میں فائدہ مند ہوگا!

○

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

اگر کوئی قوم کسی وجہ سے غلام بن جائے اس پر غیر ملکی حکمران قبضہ کر لیں اور کاروبار حکومت سنبھال لیں تو محکوم اقوام اُن کو اپنا آقا و مولا تسلیم کر لیتی ہیں۔ مگر کوئی قوم بحیثیت مجموعی ذہنی محکومی قبول نہیں کرتی۔ ایسی محکوم اقوام میں ایسے خوددار اور بے نیاز افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو دنیا و مال اور جاہ و منصب کی حرص نہیں رکھتے۔ اقبال ایسے ہی افراد کو خدا کے پاک بندوں کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ اُن کی بے نیازی اور خودی کو ایسی زرہ قرار فرماتے ہیں جو ان کو غلامی سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب تک مستغنی رہتے ہیں۔ اُن کا فکر و عمل بھی خود اختیاری رہتا ہے۔ اور کسی بھی محکوم قوم میں ایسے افراد کا وجود نعمت ہے۔ ایسے افراد ہی کی بدولت محکوم قوم غلامی سے نکل سکتی ہے۔ اقبال کے اس شعر میں یہ کہا ہے کہ دنیاوی حرص و ہوس اور جاہ و منصب سے مستغنی افراد ہی اقوام کو محکومی سے نکال سکتے ہیں۔

○

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی!
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا!
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حُر کی آنکھ ہے بینا!

اقبال سوال اٹھاتے ہیں کہ غلامی کیا؟

جواب میں فرماتے ہیں حسن وزیبائی سے محرومی۔

حسن وزیبائی ۔انسان کی خوبیاں۔انسانوں کی خوبیاں۔سماج کی خوبیاں۔سوچ کی خوب صورتی۔فکر کی خوبصورتی۔عمل کی خوب صورتی۔زندگی اور سماج اور انفرادی طور پر ایک انسان کی فکراور عمل میں جب سچائی خوب صورتی جھلملاتی ہے تو زندگی میں زیبائی پیدا ہوتی ہے۔سماجی بندھنوں میں رعنائی بڑھتی ہے۔مگر غلام اقوام کے اندر یہ خوبصورتی اور فکر وعمل کی رعنائی غائب ہو جاتی ہے۔سماج بد وضع بد ہیت اور سماجی رویون میں کج روی در آتی ہے۔ اقبال غیر ملکی حکمرانوں کے اثرات جس جس رنگ میں اور جس جس نہج سے مفتوح اقوام کو بد ہیت اور بدنُما بناتے ہیں کئی انداز میں واضح کرتے ہیں۔

اور دوسرے مصرعے میں اور بڑی اہمیت والی بات کی اس سے توثیق بھی کرتے ہیں۔ دونوں مصرعے ایک دوسرے کی توثیق کرتے ہیں جب غلام ذوق حسن وزیبائی سے محروم ہو جاتے ہیں تو پھر حکمران طبقہ حکمران اشرافیہ،حکمران غیر ملکی آقا محکوم اقوام جو چیز خوب صورت دکھاتے ہیں مفتوح عوام اور اقوام اس چیز کو خوب صورت سمجھنے لگتے ہیں۔حکمران جس بات یا نظریے کو بدصورت یا مضرت رساں قرار دیں محکوم اس کو مضرت رساں سمجھنے لگتے ہیں۔جس فیشن کو حکمران رواج دیں محکوم اس کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔محکوم اقوام بندر کی صورت بن جاتی

ہیں حکمران انھیں نچاتے رہتے ہیں اور یہ اُن کی نقل ہی کو زندگی کی خوب صورتی سمجھنے لگتے ہیں۔ان کا فہم ان کی فراست، ان کا احساس، حسن و رعنائی اور تخلیقی قوت سے محروم ہوتا ہے پھر وہ حکمرانوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے رہتے ہیں۔

دوسرے شعر میں غلامی کے ایک اور رخ کا ذکر فرماتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ غلاموں کی بصیرت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر غلام کی ایسی دانش کا ذکر ہے جو شکم پروری کی اسیر ہوتی ہے۔ شکم پروری سے مراد جائز طریقے سے روزی کمانا نہیں بلکہ اس میں ناجائز ذرائع سے اپنی آمدن کو بڑھانا ہے۔ امام حسینؑ کے مقابل لشکر یزید میں شامل اکثر یہ جانتے تھے کہ امام حسینؑ حق پر ہیں اور وہ جس لشکر میں شامل ہیں وہ ظالم ہے۔ مگر کوئی عہدہ کے لالچ میں کوئی صوبہ داری کے منصب کے لیے، کوئی سپاہ کا سالار بننے اور کوئی مال و دولت کے طمع میں لشکر یزید میں شامل تھا۔ حضرت حُر شکم پر لات مار کر لشکر حق میں آ شامل ہوئے۔ اقبال مردانِ حُر سے مراد ایسے افراد یا مرد مراد لیتے ہیں جو دنیاوی آسائشوں اور فائدوں کو ایک طرف رکھ کر حق بات سچ بات کا اظہار کرتا ہے بلکہ عملی طور پر شریک ہوتا ہے۔ بے شک اس میں مال و دولت اور جان جانے کا اندیشہ بھرپور طریقے سے موجود ہوتا ہے۔ جو دنیاوی جاہ و جلال اور منصب کے لیے حق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ایسے شکم پرور ساری قوم کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ ایسوں کی فکری پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی بصیرت پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے بلکہ حُر کی طرح کے کردار والوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ایسے لوگوں ہی کی آنکھ بینائی والی ہوتی ہے۔ ورنہ تو غلام اندھوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اُن کا حاکم جو انھیں دکھاتا ہے وہی دیکھتے ہیں۔

اقبال نے ان دو شعروں میں غلاموں کی نفسیات اور عمل کا ذکر کیا ہے!

○

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

علاج آتش رومی۔فرنگیوں کا فسوں۔
دونوں تراکیب میں اقبال نے انگریزوں کی جادوگری۔اور مولنا روم کی آتش کا ذکر کر کے ہندوستان کے غلام مسلمان کو ایک راہ دکھائی ہے۔جس پر چل کر وہ فرنگیوں کی جادوگری سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔جادوگری یا جادو کا توڑ کلمہ حق سے کیا جا سکتا ہے۔پیغام تو واضح ہے۔

○

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا' نہ تن!

انسانی فکر اور عمل کے دو متضاد رویوں کا ذکر ہے۔انسان جب اپنے جذب وشوق اور سوز و مستی میں ڈوبا ہوتا ہے یہ اس کے اندرون کا بیان ہے۔ایسی حالت میں انسان کسی فائدے کے لیے مکر وفریب سے کام نہیں لیتا مگر جب یہی انسان دنیاوی فائدوں کا اسیر ہوتا ہے جس کو اقبال تن کی دنیا قرار دیتے ہیں پھر وہ جذب دروں اور سوز دروں سے عاری ہو جاتا ہے۔پھر اس کی فکر اس کی سوچ حکمرانوں کے قبضے میں ہوتی ہے۔
دوسرے شعر میں کہا کہ افرنگی کے راج من کی دنیا پر نہیں چل سکتا۔شیخ و برہمن یعنی غلام

اقوام کے مذہبی رہنما شیخ مسلمانوں کے مذہبی رہبر اور برہمن ہندوؤں کے مذہبی لیڈر ہیں۔ ان کو اقبال فرنگیوں کے غلام کہتے ہیں۔

تیسرے شعر میں اقبال حاکم اقوام غیر اقوام کے سامنے جھکنے کو باعث شرم وندامت قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے ہاں قلندر ایام کا راکب ہے۔ وہ غلاموں کو اس بات پر شرمندہ کرتے ہیں کہ جب تم انگریزوں کے سامنے جھک گئے تو تمھارا تن بھی غلام ہو گیا من بھی غلام ہو گیا۔

یہ نقطہ قابل غور ہے کہ پہلے شعر میں اقبال تن کی دنیا اور من کی دنیا دونوں کو الگ الگ قرار دیتے ہیں مگر اس آخری شعر میں دونوں کی دولخت نہیں رہنے دیتے بلکہ یکجان کر دیتے ہیں۔ کہ تن کی دنیا من کی دنیا سے الگ نہیں ہے۔ اور نہ من کی دنیا تن کی دنیا سے الگ ہے۔

یہاں اقبال ایسے افراد ایسے رہبروں اور ایسے رہنماؤں اور گروہوں کا ذکر کرتے ہیں جو انگریزوں کے سامنے جھکنے کو ظاہری عمل قرار دیتے تھے کہ ہم انگریزوں کے سامنے اس لیے جھکتے ہیں کہ اپنے محکوم لوگوں کے لیے رعایات اور حقوق حاصل کریں دراصل ہمارا دل انگریزوں سے نفرت کرتا ہے۔

اقبال ایسی دورخی اور رویے کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب تمہارا بدن انگریزوں کے سامنے جھکنے لگا تو پھر اس عمل کے دہرانے سے تمھارا دل بھی ان کا غلام ہو گیا۔

پھر نہ دل تمھارا رہا نہ دماغ تمھارا رہا۔ نہ فکر تمھاری رہی سب پر انگریز کا راج ہو گیا!

○

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

دل اور شکم۔ آزادی شہنشائی اور موت۔

انسان بااختیار ہے۔ محکوم اقوام پر قابض حکمران ایسے افراد کو ڈھونڈ نکالتے ہیں جو شکم کے بندے ہوتے ہیں۔ وہ کسی منصب یا عہدہ کے لالچ میں غیر ملکی قابض حکمرانوں کو ولی نعمت قرار

دینے لگتے ہیں اور قابضوں کا قبضہ جسموں کے ساتھ ساتھ دلوں پر بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ ایسے افراد ہی دراصل شکم کے بندے ہیں۔ مال و دولت سے مستغنی افراد ہی آزادی کے طلب گار ہوتے ہیں۔

○

وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
کب تک رہے محکومی انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے!

سرمہ افرنگ سے مراد دانش افرنگ ہے۔ آنکھ استعارہ ہے سوچ کا فکر کا۔ ایسا ذہن جو دانش افرنگ کا اسیر ہو چکا ہو۔ وہ ہر مکاری سے کام لے سکتا ہے۔ سخن سازی کر سکتا ہے۔ مگر دل بینا نہیں رکھتا۔ جب تک دل گداز نہ ہو تو نگاہ آئینہ ساز میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس میں نمنا کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسان جو جسمانی اعتبار سے تو انسان ہی ہے مگر جب تک اس کا سینہ روشن نہ ہو۔ اس کا دل گداز نہ ہو۔ اس کے اندر انسانیت کا درد پیدا نہ ہو وہ مکمل انسان نہیں کہلا سکتا۔

مغربی علوم انسانوں کو چالاک وترار تو بناتے ہیں مگر
سود ایک کا ہے لاکھوں کی مرگ مناجات۔

یہی سرمہ افرنگ کے کارنامے ہیں۔ دنیا کی دولت سو پچاس افراد یا کمپنیوں کی ملکیت ہے اور کروڑوں انسان پانی، خوراک، علاج اور تعلیم کے بغیر حیوانوں کی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں یا زندگی انھیں گزار رہی ہے۔ پرکار وسخن ساز، نمناک، علامہ اقبال ایک سے ایک خیال کی طرف لے جاتے ہیں۔

دوسرے شعر میں اقبال محکومی سے نکلنے کے لیے صرف حاکموں ہی سے نہیں بلکہ زمین و آسمان وسورج چاند سے بھی ٹکرانے سے دریغ نہیں کرتے۔ یا تو یہ دنیا تہس نہس ہو جائے گی۔ محکومی ختم ہو جائے گی پھر آزاد دنیا پیدا ہو گی! یا پھر میں اس میں مارا جاؤں گا مگر مصرعے کے آخر میں گردش افلاک نہیں۔ گردش افلاک کی ہار کی طرف اشارہ ہے۔

O

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری!
تو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری!

اقبال کی دوررس فکر جانتی تھی کہ تہذیب افرنگ نے ایشیائی اور اسلامی تہذیب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ تہذیبی تاریخ کے مورخین اور مفکرین یہی فرماتے ہیں کہ غالب اقوام سب سے پہلے مفتوح اقوام کے تہذیب وتمدن کو مفتوح اقوام کی نظروں میں بے توقیر کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے فاتح کئی طریقے کئی رنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ تہذیب افرنگ نے بھی آزادی کے دلفریب نعرے میں محکوم اقوام کو پھنسا لیا۔ محکوم اقوام جس کو آزادی سمجھ رہی ہیں دراصل یہ محکوموں کی گرفتاری ہے۔ جس کو محکوموں کی کوتاہ نظری دیکھ نہیں پا رہی۔ یہ ظاہری آزادی جھوٹے نگوں کی چمک ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال یورپیوں اور ہندوؤں کی تہذیبی یلغار سے پناہ مانگتے اور رسول کریمؐ سے چارہ سازی کی فریاد کرتے ہیں!

کیونکہ حالات بہت سنگین ہیں جس طرح لمبا عرصہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے آریاؤں کے اندر مفتوح دراوڑوں کے سماجی رویے در آئے اسی طرح فاتح مسلمانوں کے اندر بھی ہندو سماج کے اثرات در آئے اور پھر انگریزوں کی بالادستی نے دوہرا رنگ جمایا۔ مسلمانوں کو ہر دو جانب

سے ڈرتھا۔ نئے حاکموں سے بھی اور پرانے محکوموں سے بھی۔ ذہنوں پر انگریزی اثرات اور دلوں میں ہندی اثرات۔

O

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہء دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں دے دیا۔ محکوم اور غلام اقوام کے اندر طرح طرح کے خوف اور ڈر حاکم پیدا کر دیتے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد ڈر اور خوف کے ہوتے ہوئے شروع نہیں ہوسکتی۔ جب ڈر اور خوف کے عالم سے انسان نکلتا ہے تو پھر وہ مردِ حُر کی طرح ہو جاتا ہے۔ پھر خوف کے سائے اس سے دور ہٹ جاتے ہیں۔ اس شعر میں اقبال ہندوستان کے محکوم مسلمانوں کو ڈر اور خوف کی کیفیت سے نکلنے کے لیے تیار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تم سے پہلے بھی کئی اقوام غلام رہی ہیں اور انھوں نے غلامی سے چھٹکارہ بھی حاصل کیا ہے۔ اس طرح تم بھی اس غلامی سے نکل سکتے ہو!

دوسرے شعر میں اقبال یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اگر محکوم اپنی اقدار، اپنی روایات اور اپنے علوم وفنون اور خاص طور پر اپنے دین کے سرچشموں سے جڑیں رہیں تو کوئی قوم اُن کو زیر نہیں رکھ سکتی۔ اقبال رسول کریمؐ اور حضرت علیؓ کے اخلاق و کردار کو اپنے لیے فکر و دانش کے مرکز مانتے ہیں اس لیے کوئی اور متاثر نہیں کر سکتا!

محکوم قوم سے خطاب ہے کہ اگر آج بھی کوئی حضرت موسیٰ کی طرح امت مسلمہ کو غلامی

سے نکالنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے تو درخت سے آج بھی نہ ڈر کی صدا آنے لگے۔
غلام قوم کو آزادی کی تحریک اور جدوجہد پر ابھارنے کے لیے اقبال فرماتے ہیں کہ ایک شرط تو یہ ہے کہ غاصبوں اور طاغوتی طاقتوں فرعونی حکمرانی کا ڈر اور خوف دل سے نکالنا ہے جب دل سے ڈر ختم ہوتا ہے تو پھر دنیاوی اسباب بھی فراہم ہونے لگتے ہیں۔ میدان میں اترنا۔ شرط اول ہے اور میدان میں کوئی قوم اس وقت اترتی ہے جب وہ حاکموں کا خوف دور پھینک دیتی ہے۔

دوسرے شعر میں جلوہ دانش فرنگ اور خاک مدینہ و نجف دو طرز فکر و عمل ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح اقوام کے فکر و فلسفہ سے انتہائی طور پر مرعوب و مغلوب ہو جاتی ہے۔ اور یہی مرعوبیت اور مغلوبیت محکوم کو مکمل طور پر غلامی پر رضامند کر دیتی ہے اور پھر عادی بنا دیتی ہے۔ اقبال اسی فکری اور ذہنی مغلوبیت کو غلط سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مدینہ و نجف یعنی رسول کریمؐ اور حضرت علیؓ کا فکر و فلسفہ میری فکر و نظر و دل میں تھا اس لیے میں دانش فرنگ کی چکا چوند سے مرعوب نہیں ہوا۔ اس میں رسول کریمؐ کے فلسفہ زندگی کو دانش فرنگ پر فضیلت دیتے ہیں اور جو پوری قوم دانش فرنگ کی چکا چوند سے مرعوب ہو رہی تھی اس کو جھنجھوڑتے ہیں۔

اس میں نقطہ یہ ہے کہ وہ محکوم اقوام میں جو سب سے زیادہ اور جلد مرعوب ہوتے ہیں۔ وہ خام علم والے ہوتے ہیں۔ جس طرح نیم حکیم جان کا خطرہ ہوتے ہیں۔ اس طرح نیم عالم ساری قوم کا بیڑہ غرق کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو علمی طور پر مستند ہوتے ہیں وہ اندھا دھند تقلید پر راضی نہیں ہوتے خود اقبال فلسفہ، تاریخ اسلام، قرآن اور قانون اور دوسرے مروجہ علوم پر قادر تھے اس لیے اُن کو یورپ کی دانش متاثر نہ کر سکی اور اقبال قوم کو بھی اس مرعوبیت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ خاک مدینہ و نجف اور جلوہ دانش فرنگ میں جو شعری نزاکتیں ہیں اقبال ہی کا کمال ہے۔

○

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ!
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ!

ایشیا یورپ کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے اور اب فرنگیوں کا جادو ٹوٹ رہا ہے۔ ایشیائی اقوام اس جادو کے اثر سے نکل رہی ہیں۔ اس شعر میں سحر کا لفظ خاص توجہ چاہتا ہے۔ یورپ کی ایشیا پر حکمرانی کو اقبال سحر کے لفظ سے واضح کرتے ہیں کہ یہ ایک جھوٹ فریب مکر اور چالبازی کے ور پر قائم ہے۔ جس طرح جادو دیر پا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایشیا پر فرنگیوں کا راج بھی ختم ہونے الا ہے۔ ایشیا اپنا پاسباں خود بن رہا ہے۔ اقبال کی وفات کے چند سال بعد یورپ کا جادو ختم ہو گیا اور ایشیائی اقوام محکومی سے ایک ایک کر کے نکل گئیں۔

یہ گردش زمانہ ہے یا.......... یہ گردش زمانہ ہی ہے۔ ابن خلدون نے قوموں کے عروج زوال کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ کیا اور قوموں کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا ذکر کیا ہے۔

○

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

نفسیات دان، فلسفی اور سوشل سائنسز کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے اہم ت انسان کا اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔ جب انسان کو اپنے انسان ہونے کا یقین ہوتا ہے تو اس میں انسانیت موجود رہتی ہے۔ جب وہ اپنے آپ کی آگاہی سے دور جا پڑتا ہے تو جسمانی طور پر تو انسان ہی ہوتا ہے مگر اخلاقی اور سماجی طور پر اسفل ترین مخلوق بن جاتا ہے۔ ذہن فکر کی بلندی ر آگاہی ہی اس کو پاتال میں گرنے سے بچاتی ہے۔ آج ہندوستان کا غلام انسان عمومی طور پر اس آگاہی اور بلندی سے گر چکا ہے۔ اس میں اپنی آگاہی ختم ہو چکی ہے۔ انسانی شرف سے

انسان محروم ہو چکا ہے۔ جب کوئی انسان اپنے آپ سے آگاہ ہوتا ہے تو دوسرے انسانوں کے لیے سودمند ہوتا ہے جب کوئی قوم غلام بن جائے تو اپنے انسانی شرف سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے۔

عشق اقبال کے ہاں صد رنگ جذبہ بھی ہے فکر بھی ہے۔ دل بینا ہے جو تاریکیاں دور کرکے دماغ کو رعنائی عطا کرتا ہے۔ جب انسان کا دل بینا ہوتا ہے تو دماغ کے خشک سوتے سیراب ہونے لگتے ہیں اور انسان اپنی حیثیت مجموعی کا اندازہ کرتا ہے۔ ماضی وحال کا جائزہ لیتا ہے اور مستقبل کی پلاننگ کرتا ہے۔ اور جدوجہد اور عمل پر کاربند ہوتا ہے۔
جب خود آگاہی ہوتی ہے تو غلامی کی زنجیریں خود بہ خود کٹ کر گرنے لگتی ہیں۔

○

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ!

اس شعر میں چار سماجی حالتوں کا ذکر ہے۔ ان کو فکری اور ذہنی حالتیں بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری فقیری شاہی کو ایک طرف رکھیں۔ چونکہ اقبال کے زمانے میں ہندوستان غلام تھا۔ انگریزوں نے بہ جبر مسلمانوں اور ہندوؤں کو غلام بنالیا تھا۔ اقبال اس غلامی پر کڑھتے ہیں اور ہندوستانیوں کو بتاتے ہیں کہ بغیر جرات و ہمت و عزم کے کبھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ غلامی کی قید سے نکلنا ہے تو ڈر خوف کو ایک طرف رکھ کر جرات اور ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ دنیا میں کوئی کام بھی رِندوں جیسی جرات کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں پورے یقین اور پوی ہمت سے اُس میں جُت جاتے ہیں اور کامیاب و سرخرو ہوتے ہیں!

رباعیات

○

یقیں مثلِ خلیلؑ آتشِ نشینی!
یقیں اللہ مستی، خود گزینی!
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

اس رباعی میں اقبال غلامی سے بھی بدتر چیز بے یقینی قرار دیتے ہیں کیونکہ بے یقینی کی کیفیت میں انسان فکری طور پر لرزاں رہتا ہے۔ عالم برزخ میں ہوتا ہے۔ اور عملی طور پر عمل سے عاری ہوتا ہے۔ بے یقینی اس لیے غلامی سے بدتر ہے کہ بے یقین قوم غلامی سے نجات پانے کی آرزو سے عاری ہوتی ہے۔ جب ایسی قوم بے یقینی کی حالت سے نکل آتی ہے تو غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالتی ہے۔ حضرت خلیل کے پاس یقین کی طاقت ہی تھی جس کے سبب آپؑ آگ میں بیٹھ گئے۔ اللہ پر یقین نے انھیں اس آگ میں اطمینان بخشا۔ سائیکالوجی میں بھی یقین اور بے یقینی پر مباحث ملتے ہیں اور بے یقینی کو بدتر کیفیت اور ایک بیماری قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں کیفیتیں ذہنی کیفیتیں ہیں۔ اور ان کا اظہار انفرادی طور پر ایک انسان اور مجموعی طور پر قوم کے اطوار سے ہوتا ہے۔

نہ اہل ایماں نہ اہل یقین فقط ہے یقیں۔ راشد
بے یقینی کی حالت اس لیے غلامی سے بدتر ہے کہ یہ غلامی کو دوام دیتی ہے!

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اس نظم میں پہلے لینن نے خدا کے حضور کچھ سوال اٹھائے تھے معاملات دنیا یعنی سیاست اور معیشت اور مذہب اور ان کے متعلقات کے بارے میں۔

پھر فرشتوں کا گیت ہے

اور پھر فرمان خدا ہے فرشتوں سے

اس میں خدا خدائی قوتوں کو حکم دیتے ہیں کہ اٹھو اور میری دنیا کے غریبوں کو جگاؤ۔ یہاں جگاؤ سے مراد فکری اور علمی سطح ہے۔ جس پر کچھ موقع پرستوں نے قبضہ کرلیا ہے اور اصل پیغام خدا کو بدل دیا ہے۔ اب لینن کے سوالات کے جواب میں خدائے بزرگ و برتر فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ غلاموں کے لہو کو گرماؤ سوز یقین سے۔ پہلے بھی کہیں اقبال فرما چکے ہیں کہ یقین بڑی قوت رکھتا ہے۔ جب غلاموں کے دلوں میں سوز یقین پیدا ہوگا تو ان کا لہو گرم ہوگا تو آزادی کی تگ و دو شروع ہوگی۔ جب سوز یقین سے لہو گرم ہوتا ہے تو اگر، مگر، لیکن، کیوں، ایسے، کس طرح کی بے یقینی ختم ہو جاتی ہے اور پھر چڑیا بھی شاہین پر جھپٹ پڑتی ہے۔ یقین کی دولت ہاتھ آجائے تو ظاہر اسباب کی کمی آڑے نہیں آتی۔ فرشتوں سے خطاب میں اور بھی حکم خداوندی ہیں مگر وہ ہمارے موضوع سے ورا ہیں! غلامی خدا کو ناپسند ہے۔ اسی لیے فرشتوں کو فرمایا ہے کہ غلاموں کی فکر اور سوچ کو بیدار کرو۔

ساقی نامہ

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

ساقی نامہ اقبال کی عظیم نظموں میں ہے۔ بہر حال ہم اس ایک شعر کو جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ ویسے تو پوری نظم کسی نہ کسی رنگ میں ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ اس شعر میں فکری غلامی کی طرف اشارہ ہے۔ غلامی کی بدترین صورت ذہنی غلامی ہے۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی ذہنی غلامی میں آ جاتی ہے تو اس کا غلامی کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اقبال اسی لیے اس ذہنی و فکری غلامی سے پناہ مانگتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں جوانوں کو پیروں کا استاد کر! کہہ کر ایک اور سنگین صورت احوال کو بیان کرتے ہیں۔ عمومی طور پر غلاموں کی وہ نسل جو ادھیڑ اور بوڑھوں پر مشتمل ہوتی ہے وہ غلامی کو قبول کر چکے ہوتے ہیں اور اقبال اس راز کی حقیقت کو سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے کئی بار جوانوں اور نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ نوجوانوں اور جوانوں کے ذہنوں میں آزادی کی تڑپ اور لگن جگانے کی ضرورت ہے اور وہی غلامی سے نکلنے کے لیے برسر پیکار ہوں گے۔ اور قافلہ سالاری بوڑھوں سے لے کر جوانوں کو سونپ دینی چاہیے۔ کچھ اعتراض کرنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال بزرگوں کے بجائے نوجوانوں کو عزت دے رہے ہیں۔ یہ اعتراض برائے اعتراض ہی ہوگا کیونکہ عزت کردار و عمل کی بنیاد پر ہوتی ہے نا کہ سن رسیدہ ہونے کی بنا پر۔ نئی فکر اور نئی سوچ بوڑھے قبول نہیں کرتے۔ پھر جوان اور نوجوان ہی دنیا کی کایا کلپ کرتے ہیں۔ غرض اقبال غلامی کی ہر صورت اور ہر کیفیت کو تکلیف دہ جانتے ہیں۔ اور غلامی سے نکلنے کے لیے فکر و عمل پر ابھارتے ہیں!

زمانہ

ہوائیں اُن کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے،
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!
جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مُقامِروں نے، بنا دیا ہے قِمار خانہ!

پہلے شعر میں فرنگیوں کی غاصب حکمرانی کا بیان ہے کہ انھوں نے ہواؤں، فضاؤں، سمندروں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ مگر وہ دراصل بھنور کی گرہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اب اس بھنور سے نہیں نکل سکتے۔ دوسرے شعر میں متحرک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ عالم پیر مر رہا ہے ایک نظام مرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اور جہاں نو ہو رہا ہے پیدا۔ ایک نیا جہاں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک دنیا مر رہی ہے۔ ایک دنیا پیدا ہو رہی ہے۔ جو جہاں مر رہا ہے وہ اپنے اندر کے تضادات کے سبب مر رہا ہے۔ فرنگی جوابازوں نے ساری دنیا کو جوا خانہ بنا دیا ہے۔ اور جوا خانہ ایسی جگہ یا ایسا کاروبار ہے جس کی بنیاد محنت نہیں بلکہ فریب چالاکی اور دغابازی پر ہوتی ہے۔ اور عموماً ایک دولت پر اپنی چالاکیوں کے سبب قبضہ کر لیتا ہے اور فرنگیوں نے غلام ملکوں کو جوا خانہ ہی بنا دیا تھا۔ اُن کی دولت اور خام مال سستا لے جاتے اور اشیا تیار کر کے مہنگے داموں ان ہی غلاموں کو دیتے۔ انگریزوں کی دنیا پر حکمرانی لوٹ کھسوٹ ہی کے لیے تھی۔ یورپ کی آسودگی محکوموں کی تباہ حالی کی نقیب ہے۔

تمہید

○

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح تریاکی!
اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی!
عطا ہوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلے میں ہے سر کشی و بے باکی!

ان اشعار میں غلامی اور محکومی کے الفاظ تو موجود نہیں مگر ذکر مشرق کا اور غلام اقوام ہی کا ہے۔ پہلے شعر میں ہندو اور مسلمان دو بڑی اقوام کی مناسبت سے دیر اور حرم کا ذکر ہے۔ دونوں اقوام کے مذہبی رہنما اپنی اپنی قوم کو خودی کی تعلیم نہیں دے پا رہے۔ یوں لگتا ہے کہ مشرقی اقوام نے افیون گھول کر پی ہوئی ہے۔ تگ و دو کوشش اور جد و جہد سے عاری ہو چکے ہیں۔

دوسرے شعر میں غلام اقوام کی نفسیات واضح کرتے ہیں۔ عملی طور پر ایسے ہوتا ہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ جب دنیاوی جاہ و جلال چھن گیا۔ مال و دولت لٹ گیا۔ حاکم سے محکوم بن جانے والی اقوام نے آسمانوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ دنیاوی تگ و دو سے الگ ہو کر تصوراتی اور تخیلاتی دنیا بسا لی اور اس میں مگن اور خوش رہنے لگے۔ اقبال کی فکر کے مطابق تصورات میں مگن رہنے والی اقوام قوت عمل سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اقبال غلامی سے

نکالنا چاہتے ہیں اور دنیا کے معاملات اور تگ و تاز میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ آخری شعر میں ایشیا کا ذکر ہے۔ خس و خاشاک ایشیا مجھے عطا ہوا ہے۔ خام مال کم حیثیت ہے مگر میری فکر اسی خس و خاشاک کو نئی زندگی اور نئی طاقت اور قوت عطا کرے گی۔ اقبال نا امید نہیں۔ بہتر مستقبل کی امید رکھتے ہیں! اسی خس و خاشاک سے آزادی کا شعلہ نکلے گا۔

○

جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے
وہ پر شکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند!

ایسی قوم جو غلامی میں اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اس کے اس سے نکلنے کی امید نہ تھی۔ (چینی اور افیونی ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ مگر اقبال کے دور میں چینی جاگ رہے تھے)

اقبال کی آواز سے پے بہ پے آواز سے ان ہندوستانی غلاموں کے دلوں میں جذبے جاگ اٹھے ہیں اور ایسی قوم جو اپنے گھر آنگن میں ٹوٹے پروں کے ساتھ خوش و خرم زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ اب فضائے نیل گوں میں پیرنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

دونوں اشعار میں اقبال اپنے نغموں کے اثرات کا ذکر فرماتے ہیں۔ افیونیوں اور پر شکستہ سست کاہل اور بے عمل قوم کے اندر اقبال کے ترانوں کے سبب جذبہ بیدار ہونے لگا ہے اور قوت عمل بیدار ہونے لگی ہے تو پر شکستہ آسمانوں پر پرواز کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

تن بہ تقدیر

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
''تن بہ تقدیر'' ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو نا خوب بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غلامی میں قومیں کس طرح اپنی فکر اور اپنے مذہب کو بدل لیتی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں جب مسلمان آزاد تھے تو قرآن کریم سے انھیں ستاروں پہ کمند ڈالنے کا درس ملتا تھا مگر غلامی میں مسلمانوں نے قرآنی تعلیم کو بدل کر ترک جہاں کی تعلیم ڈھونڈ لی ہے۔

وہی مسلمان جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر چھپی ہوتی تھی اب ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے ہیں اور اپنی بے عملی اور ناکامی کو خدائی تقدیر قرار دے کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے رہے ہیں غلامی میں اس طرح کی توجیہات سامنے آتی رہتی ہیں۔

غلامی میں قوموں کے ضمیر آہستہ آہستہ بدلتے ہیں اور یہ تبدیلی کبھی کبھی اتنے غیر محسوس انداز میں روپذیر ہوتی ہے کہ بدلنے والے کو اپنے ضمیر کے بدل جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ غلامی میں چیزوں کو دیکھنے پرکھنے تجزیہ کرنے اور نتائج کے استخراج کرنے کا وطیرہ ہی بدل جاتا ہے۔ وہی چیزیں اور معاملات حاکمی کے دور میں بری سمجھی جاتی ہیں۔ غلامی میں انھی چیزوں

میں خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ بلندی سے چیزیں اور نظر آتی ہیں اور پستی میں کھڑے دیکھیں تو اور طرح نظر آتی ہیں۔

غلام اقوام اپنی بے عملی اور کاہلی اور ناکامیوں کو تقدیر کا لکھا کہہ کر خود بری الذمہ ہونے کی کوشس کرتے ہیں۔ حالانکہ جب یہ باعمل اور باکردار تھے تو ان کے ارادوں میں خدائی تقدیر چھپی ہوئی تھی۔ غلامی میں خوب اور ناخوب کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ اقبال نے غلام سماج کا سائیکلوجیکل جائزہ پیش کیا ہے۔

زمین و آسماں

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا!
ہے سلسلہ احوال کا ہر لحظہ دگرگوں
اے سالکِ رہ! فکر نہ کر سود و زیاں کا!
شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا!

ان تین اشعار میں اقبال غلام اقوام کی نفسیات اور سوچ کا ذکر فرماتے ہیں۔غلام اقوام کو اپنی غلامی کا احساس نہیں ہوتا۔وہ اس خزاں کو بہار سمجھنے لگتی ہے۔

دوسرے شعر میں وہ سالک کو سمجھاتے ہیں کہ یہ دنیا یہ کائنات ہر لحظہ حرکت اور تگ ودو میں ہے۔نفع اور نقصان کی سوچ تو ایک تاجر اور دوکان دار کی سوچ ہے۔دنیا کے معاملات تاجرانہ سوچ سے نہیں حل ہوتے۔تاجرانہ سوچ سے بالا ہو کر ہی ہر لحظہ بدلتی دنیا سے پنجہ آزمائی کی جاسکتی ہے۔

جس زمین کو تو اپنے لیے بلندی سمجھ رہا ہے،ہوسکتا ہے کہ یہ کسی اور کے قدموں کے نیچے ہو۔اقبال ہندوستان کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تم غلامی میں جکڑے ہوئے ہو۔تم پر موسم خزاں چھا چکا ہے۔تم پستی میں پڑے ہوئے ہو۔

اقبال یہ اس لیے بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ غلامی میں خوش ہیں۔اس کو موسم بہار

سمجھ کر زندگی گذار رہے ہیں۔ پستی میں پڑے ہوئے اپنے آپ کو بلندی پر سمجھتے ہیں۔ اقبال اس مغالطے سے ہندوستانیوں کو نکالنا چاہتے ہیں اور ان غلاموں کو اصل صورت احوال سے آگاہ کرتے ہیں کیونکہ جب تک صورت احوال کا صحیح اندازہ نہ ہو قومیں راہ عمل کا تعین نہیں کر سکتی۔ اقبال یہی چاہتے ہیں کہ موجودہ حالت کا انھیں ٹھیک طرح پتہ چلے تو اس حالت سے نکلنے کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کریں!

اجتہاد

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

محکومی، تقلید، زوال تحقیق، اجتہاد آہ! بھرتے ہیں۔

سوشل سائنسز کے مفکرین کہتے ہیں کہ کسی بھی سماج یا قوم کے اندر جب تقلید کا چلن ہوتا ہے تو اس میں تحقیقی مزاج آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور مزاجاً وہ سماج یا قوم جن کی تقلید پر کاربند ہوتی ہے اُن کی ذہنی غلام بن جاتی ہے اور پھر ایسی قوم یا سماج پر باہر سے کوئی اور قوم آکر حاکم بن جاتی ہے۔ غرض کے یہ تینوں حالتیں آگے پیچھے آتی اور راسخ ہوتی ہیں۔

اور غلامی میں غلاموں کا مزاج بدل جاتا ہے۔ ان کی فکر بدل جاتی ہے۔ ان کا سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ ان غلاموں کی سوچ ہے کہ قرآن پاک کو ناقص قرار دیتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ کتاب غلامی کے طریق نہیں سکھاتی۔ قرآن پاک تو انسانوں کو غلامی سے نجات دلانے والی پاک کتاب ہے۔ اقبال کے زمانے میں قرآن پاک ہی سے انگریزوں کی حکمرانی اور حکم برداری کے لیے

اطیع اللہ و طیع الرسول و الطیع الامر

سے بیان کرتے تھے۔

اس سے غلامانہ فکر کا انداز فکر واضح ہوتا ہے۔

شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں، مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند!
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند!
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند!

اقبال اللہ کی ذات کا شکر ادا کرتے ہیں اور شکایت بھی کرتے ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ مجھے تو نے اس دیس میں پیدا کیا ہے جس کے رہنے والے غلامی پہ رضامند ہیں۔ رضامندی ایک فکری اور دلی کیفیت ہے۔

پہلے شعر میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ان کا دل فنا فی اللہ ہو چکا ہے۔ یہ روحانی بلندیوں کا بلند مقام ہے۔ وہ پاکیزہ و مصفا کیفیت ہے جہاں جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ والی صورت ہوتی ہے۔

چونکہ دل میں خدا موجود ہے اسی وجہ سے اقبال کے نغموں میں یہ اثر ہے کہ خزان کے موسم میں بھی مرغ زار کے مرغ سحر خوانی میں خوش ہوتے ہیں۔ خزاں میں پرندے چہچہانا کم کر دیتے ہیں دلوں میں پژمردگی بسیرا کر لیتی ہے۔ مگر اقبال کے نفس کے اثر سے ہندوستان کے غلام باشندے بھی آزادی کا نغمہ الاپنے لگے ہیں۔ غلامی میں آزادی کے گیت گانا آزادی کی

خواہش کے سبب سے ہے۔ بس سونے جاگنے کی کیفیت ہے۔ کبھی اقبال کے نغموں کے اثر سے غلام جاگنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی حکمرانوں کی ساحری کام دکھاتی ہے اور غلام کو سلا دیتی ہے۔ اقبال کا دورِ حاضر کے فرعونوں سے مقابلہ ہے۔ زمانے کے فرعون ساحری سے کام لے کر غلامی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال ضربِ کلیمی سے غلام کو جگانا اور فرعونوں کو بھگانا چاہتے ہیں۔ اقبال کی وفات کے دس سال بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس میں اقبال کی فکر اور ترانوں کا بھی حصہ ہے!

سلطانی

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی!
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی!

اس میں یہ نقطہ اقبال واضح کرتے ہیں کہ غلامی باہر سے نہیں آئی۔ پہلے ضعف خود قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے اعضا میں ضعف پیدا ہوتا ہے بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں۔ اسی طرح قوموں کے اندر پہلے بے دلی بد دلی تقلید روباہی پیدا ہوتی ہے تو پھر کوئی طاقت وراس پر حملہ آور ہو کر اس کو غلام بنالیتا ہے۔ مسلمان بھی اس لیے غلام ہوئے کہ ان سے فقر کی نگہبانی نہ ہو سکی۔

دوسرے شعر میں مسلمانوں کے کردار کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کا ذکر ہے۔ مسلمان دنیا کے اندر چاند کی طرح چمکنے والے تھے یعنی ان کا کردار واضح اور خوب صورت تھا۔ دنیا کو روشنی عطا کرنے والا تھا۔ مگر اس کردار کو انگریز نے خرید لیا اور بدل دیا۔

ایک نقطہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمانوں کی عبادت میں روح زندہ تھی تو ان کے سجدوں کے نشانوں والی پیشانیوں سے چاند کی طرح روشنی نکلتی تھی جب فرنگی نے روح نکال لی اور عبادت صرف عادت رہ گئی تو مسلمان کی سلطانی ختم ہوئی اور غلام بن گئے۔

ہندی اسلام

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
مُلاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

جب قومیں غلام ہوتی ہیں تو وہ نیا بیانیہ تخلیق کر لیتی ہے اپنے طور پر وہ کوئی بڑا تیر مار رہی ہوتی ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ نئے بیانیہ کی تخلیق دراصل اُن کے غلامی میں پختہ ہو جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ارکان اسلام کے ادا کرنے کی اجازت سے ملا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔ اقبال کا طریقہ یہ ہے کہ خاص واقعات سے عمومی نتائج کا استخراج کر کے پوری قوم کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ خاص واقعات کو خاصیت میں محدود نہیں کر دیتے۔ چونکہ اقبال کا خطاب عام مسلمانوں اور غلام ہندوستان سے ہے۔ اس لیے عموماً اس کو عمومی رنگ دیتے ہیں۔ نقطہ یہ ہے کہ حلیم طبع حکمران ظالم حکمرانوں سے زیادہ ظالم ہوتے ہیں کیونکہ وہ کچھ نرمی برت کر محکوم اقوام کے اندر ایک طبقہ ایسا پیدا کر لیتے ہیں جو اُن کی حکمرانی کو نا صرف جائز بلکہ نعمت خداوندی قرار دینے لگتا ہے۔ اقبال یہاں بھی حکمرانوں کے اسی طریقہ کا ذکر کرتے ہیں کہ عبادات کی اجازت دے کر اپنی ناجائز حکمرانی کو جائز قرار دینے کی انگریزوں کی کوشش کا ذکر کرتے ہیں۔

نیم آزادی مکمل غلامی سے زیادہ بُرے اثرات مرتب کرتی ہے ایسی غلامی میں غلامی کا احساس کم ہوتا ہے محکوم اپنے آپ کو کچھ کچھ آزاد سمجھنے لگتا ہے اس طرح غلامی سے نکلنے کی تڑپ اور لگن دل دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

نکتۂ توحید

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہِ غلامانہ ہو تو کیا کہیے!

غلامی اور آزادی میں انسانی فکر و عمل میں بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بندۂ حُر جس طرح حالات کا جائزہ لیتا ہے اس طرح ایسا مرد جو غلام ہو وہ نہیں لے سکتا۔ غلامی میں فکر اور عمل میں شدید تبدیلی آ جاتی ہے۔ ایک آزاد انسان یا قوم کے سوچنے کے انداز اور ایک غلامی انسان یا قوم کے سوچنے کے انداز میں زمین آسمان کا فرق آ جاتا ہے۔ آزاد کی فکر اور عمل میں بلندی ہوتی ہے۔ غلام کی فکر میں پستی اور عمل میں تقلید بلکہ تقلید جامد پائی جاتی ہے۔ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات دیتا ہے۔ ایک آزاد انسان ہی نکتہ توحید سمجھ سکتا ہے۔ غلامانہ فکر کئی خداؤں کی پجاری ہوتی ہے۔ بندۂ حُر ہی توحید کی حقیقت کے مقامات کے مشاہدات سے منسلک ہو سکتا ہے۔

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز!
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

پہلا شعر اس نظم کا پہلا شعر ہے۔ دوسرا شعر اس نظم کا آخری شعر ہے۔

جب انسان درپیش حالات و معاملات کا بہ نظرِ غائر تجزیہ کرتا ہے تو کوئی ایک نقطہ یا کئی نقاط اس کے دل و دماغ پر روشن ہوتے ہیں۔ اس کو الہام کہتے ہیں۔ ہم اس کے دوسرے مذہبی مباحث میں نہیں پڑتے۔ ان دونوں اشعار میں بھی اقبال یہی معنی لیتے ہیں۔ اگر کوئی آزاد فرد یا قوم حالات و معاملات کا جائزہ لے کر اپنے لیے کوئی راہ عمل طے کرتا ہے تو ایسا الہام اس کے فکر و عمل کے لیے ایڑی کا کام کرتا ہے۔ ایڑی راہوار کو تیز کرنے کا کام کرتی ہے اور اگر اسی عمل سے کوئی محکوم فرد یا قوم کام لے تو نتائج بہت خوف ناک اور غارت کر دینے والے تباہ و برباد کر دینے والے ظاہر ہوں گے۔ صورت چنگیز کہہ کر اقبال غلاموں کے الہام کو ہلاک کر دینے والا فکر و طرزِ عمل قرار دیتے ہیں۔

الہامی کتابیں جو خدا کی طرف سے اپنے پیغمبروں پر وحی کی گئیں۔

اے پیرِ حرم

تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارُو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سَری کا!

فن شیشہ گری اور خارہ شگافی کے طریقے۔فن فنکاری عیاری اور مکاری کے معنوں میں آیا ہے۔نازکی کے معنی بھی دیتا ہے۔کم پائیداری کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔خارہ شگافی کے طریقے، سخت کوشی، قوت، طاقت اور سختی کے اور پائیداری کے معنوں میں آیا ہے۔اقبال مغربی اور مشرقی مزاج کا اسی طرح موازنہ کرتے ہیں۔مغربیوں نے اپنی حکمرانی کے زمانے میں غلاموں کو اپنی تہذیب کی چکا چوند کے ذریعے الجھانے کی کوشش کی ہے۔اقبال پیرِ حرم سے کہتے ہیں کہ تو اُن کو اپنی تہذیب وتمدن پر واپس لے آیا۔

دو صدیوں کی غلامی نے ان کے مزاج اور فطرت کو بدل دیا ہے۔ان کے دل مایوس اور پژمردہ ہو چکے ہیں۔اے پیر حرم تو ان کی پریشان نظری کا علاج ڈھونڈ جوان کو اس ذہنی وفکری غلامی سے نجات دلا دے۔جو ان کے اندر ہمت قوت طاقت بحال کر دے۔ان کی فکر جو پریشاں ہے اس کو یکجا کر ایک منزل کا تعین ان کے لیے کر دے تا کہ یہ یکسو ہو کر اسی غلامی سے نکلنے کے لیے جدو جہد پر تیار ہو پائیں۔

آزادی

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

غیر ملکی حکمران محکوم اقوام سے کئی رنگ میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔ ان کو ان کے دین، مذہب اور تہذیب سے برگشتہ کر دیتے ہیں۔ اُن کے ذہنوں کو غلام بنا لیتے ہیں مگر ظاہری انداز میں آزادی کا ڈھنڈورہ بھی پیٹتے رہتے ہیں یہ دورنگی حکمران طبقے قائم رکھتے ہیں اس طرح محکوم قوم کے اندر حاکموں کے ہمدرد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے بھی کئی رنگ ہوتے ہیں۔ کچھ تو نادانستگی میں حکمرانوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ کچھ دانستہ طور پر عہدہ منصب شہرت دولت کے لالچ میں حکمرانوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ اور کچھ وقتی ضرورت کے تحت مفاہمت کی پالیسی اپناتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی انگریزوں نے مسلمانوں کو محکوم کر لیا مگر مسلمانوں کو نماز، روزہ کی اجازت عنایت فرما دی۔ نماز، روزے کی آزادی کو اسلام اور مسلمانوں کی آزادی قرار دیا جانے لگا۔ اقبال اسی دورنگی کو دور کرتے ہیں اور فرماتے ہیں حقیقت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام بھی محبوس ہے اور مسلمان بھی محبوس ہے غلام ہے قیدی ہے۔ مسلمان کی ظاہری یا انگریز کی عنایت کی ہوئی آزادی کو اقبال آزادی نہیں سمجھتے۔ اقبال غلامی کے ہر رنگ اور ہر انداز کی قلعی اتارتے ہیں تا کہ غلام مسلمان اس دھوکہ دہی کو سمجھ سکیں اور آزادی کے لیے جدوجہد پر تیار ہو سکیں۔ کیونکہ جب قیدی کو آزاد کہا جائے تو اس میں حربہ یہ ہے کہ قیدی کو قید کے احساس سے نکال دیا جاتا، انگریزوں نے یہی حربہ استعمال کیا مگر اقبال ہر حربے اور طریقے اور چالبازی کو عیاں کرتے ہیں! اسلام اور مسلمان کو آزاد اور محبوس کہہ کر انگریزوں کے پروردہ مسلمان راہنماؤں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اشاعتِ اسلام فرنگستان میں

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبول دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

ان تین شعروں میں اقبال نے غلام اور آقا کے مزاج اور مقام کو عیاں کیا ہے۔ دوسرے شعر میں ایک حقیقت جو غلام ہندوستان میں رونما ہو رہی تھی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ غلام ہندوستان کا برہمن اگر دین مسیحی بھی قبول کر لے تو بھی حکمران آقاؤں کے ہاں اسے عزت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ آقا مذہب کی بنیاد پر ہم پلہ و ہم مرتبہ خیال نہیں کرتے۔ عموماً ہوتا ہے کہ غاصب قوم کے زیر اثر مقام و مرتبہ کی ہوس لالچ میں مفتوح اقوام میں سے چند لوگ فاتح کا مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ یہ کرنے کے باوجود ان کی محکومی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اسی طرح اگر کوئی انگریز دین محمدؐ قبول کر لیتا ہے تو مسلمان غلام قوم کے حالات و معاملات میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ آقا آقا ہی رہے گا غلام غلام ہی رہے گا۔ کچھ لوگ کبھی کسی انگلستان کے انگریز کے قبول اسلام سے یہ سمجھیں کہ غلاموں کے دن پھر جائیں گے یہ ناممکن ہے۔ غلام غلام ہی رہے گا۔

قُم باذن اللہ

کِیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قُم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قُم باذن اللہ

مردوں کو اٹھانے کے لیے یہ کلمہ بولا گیا۔ اقبال بھی ہندوستان کے محکوم مسلمانوں کو جن پر موت قبضہ پا چکی ہے جگانے کے لیے یہ کلمہ دھراتے ہیں۔

ہندوستان کے محکوم مسلمانوں کو اقبال یاد کرواتے ہیں کہ تمھاری رگوں میں وہی قوت ہے جس نے منصور کو آتش ناک کیا اسی آتش نے انا الحق کو حق سے واصل کر دیا۔ آتش کی لپک اٹھان اوپر کی طرف جاتی ہے اور خاک زمین پر گری پڑی رہتی ہے۔ اقبال غلام مسلمانوں میں وہی لپک اور اٹھان چاہتے ہیں تا کہ یہ افتادگان خاک اس خاکدان سے نکل کر سیاروں ستاروں کے راکب بنیں۔ اور یاد دلاتے ہیں کہ تری اصل میں یہ جوہر موجود ہیں بس اک ذرا جاگنے سمجھنے کی دیر ہے۔ آخری شعر میں پراگندہ ہے شعور ترا۔ کہہ کر بھی اقبال محکوم مسلمان کو سمجھاتے ہیں کہ فرنگیوں نے اپنی جادوگری سے تیری فکر اور سوچ اور دل کو منتشر خیالات سے بھر دیا ہے۔ تری فکر کو خالص نہیں رہنے دیا۔ تیرے دل کو بے یقینی اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ پہلی ضرورت ہی اس بات کی ہے کہ شعوری طور پر اس شعوری فکری پراگندگی یعنی انتشار سے نکلا

جائے۔اپنے حواس خارجی و باطنی کو ایک نقطے پر مرتکز کیا جائے تب ہی کوئی لائحہ عمل طے ہو پائے گا۔ پریشان فکری ونظری سے نکلنے کے بعد غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر گرنے لگیں گی!

مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ تمہارے خون میں وہی آتش ہے۔ یہ آگ تمہارے اندر پوشیدہ ہے۔تمہارے رگوں میں موجود ہے۔ یہ آگ کہیں دوسروں سے مانگ کرنہیں لانی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اپنے منتشر خیالات کو یکجان کرواور یکسوئی اختیار کروتو پھر وہی آتش دوبارہ تمہارے اندر حرارت پیدا کر دے گی اور یہ آتش قم باذن اللہ، مُردوں کو زندہ کر دینے والی ہے۔

اقوامِ مشرق

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

اقوامِ مشرق اقبال کے زمانے میں غلام تھیں۔ غلامی کئی انداز میں غلاموں کی فکر اور نظر کو بدل دیتی ہے۔

غلام قوموں کے حواس باطنی بھی شکست وریخت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حواس ظاہری بھی پوری طرح کام نہیں کرتے۔

محکومی اور تقلید دونوں کو اقبال باہم ایک ہی سمجھتے ہیں۔ تقلید میں انسان سے قوت تخلیق چھن جاتی ہے۔ غلامی میں تخلیق واختراع کی روشنی اندھیرے میں بدل جاتی ہے۔ اقبال اسی کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ بے پردہ حقائق بھی محکوموں اور غلاموں کو نظر نہیں آتے۔ آنکھ جن کی محکومی اور غلامی میں رہنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو چکی ہے۔ ان کو انگریزوں کے ظلم نظر نہیں آتے کہ کس طرح حاکم انگریز محکوم اقوامِ مشرق کی تہذیب وتمدن اور علمی خزانوں کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ کس طرح اقوامِ مشرق کے ادیان کو حقیر بنا رہا ہے۔ ایسی اور ہزار باتیں بھی عیاں ہیں مگر محکوم اقوامِ مشرق کو انگریز حاکوں کے یہ ہتھکنڈے نظر نہیں آ رہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوامِ مشرق عرصے سے غلامی وتقلید میں زندگی گزار رہی ہے۔ اس وجہ سے ان کی آنکھ کی بینائی بھی اور دل کی بینائی بھی ختم ہو گئی ہے!

محکومی میں تقلیدی مزاج پختہ ہو جاتا ہے اور اگر بندہ تقلید کا عادی ہو تو اگلی منزل محکومی غلامی کی ہے اور غلامی کا یہ رنگ بغیر حملہ اور قبضہ کیے بھی ہو سکتا ہے۔ حملے اور قبضے کی نوعیت اور ہو سکتی ہے۔

مصلحینِ مشرق

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی!
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

اصلاح کرنے والے۔تہذیب سکھانے والے۔مہذب بنانے والے۔مشرق پر جب اقوام مغرب نے قبضہ کرلیا تو انھوں نے یہی دلفریب نعرہ لگایا کہ وہ اقوام مشرق کو جو کہ اجڈ ہیں۔بے وقوف ہیں۔بدتہذیب ہیں انھیں مہذب بنانے کے بعد مشرق کو آزاد کردیں گے چونکہ ابھی یہ غیر مہذب ہیں اس لیے ایک مہذب قوم کی حکمرانی ان غیر مہذبوں کے لیے نعمت ہے۔اقبال فرماتے ہیں کہ ان کا یہ نعرہ سامری کی فنکاری کی طرح ہے جس نے آل موسیٰ کو بدراہ کردیا تھا اس کا اپنا دامن خالی تھا۔اس طرح ان انگریزوں یعنی اقوام مغرب کا اپنا دامن تہذیب سے خالی ہے۔جس طرح اقوام مغرب نے انسانیت کو لوٹا ہے کھسوٹا ہے۔بنجر کردیا ہے۔ویران کردیا ہے۔اس طرح تو بڑے سے بڑے لٹیروں نے بھی نہیں کیا۔اقبال کے سو سال بعد بھی اقوام مشرق، اقوام مغرب کی مقروض ہیں۔اقبال نے سو سال پہلے ان کے مہذب ہونے کا قلعی اتاردی تھی۔

دوسرے شعر میں اقبال اُن کے علم کے بارے میں بھی فرماتے ہیں کہ علم کا کمال یہ کہ انسان کو انسان بنائے۔ایسا علم جو لوٹ کھسوٹ پر مائل کرے وہ علم ضرر ہے۔ان کے بادل بجلی

سے روشنی سے پانی سے خالی ہیں۔اقبال کا فرمان آج سو سال بعد بھی سچ ہے کہ آج بھی دنیا پر امریکہ اور اقوام مغرب کی حکمرانی ہے اور دنیا سلگ رہی ہے۔ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔

بے شک مشرق کی اصلاح کرنے والے اہل مغرب نے اس بُری طرح مشرق کو لوٹا ہے آج آزادی ملنے کے ستر اسی سال بعد بھی مشرقی اپنے قدموں پر کھڑے نہیں ہو سکے۔ان مغربیوں نے جب بہ امر مجبوری کالونیوں کو خالی کیا (اقبال کی وفات کے بعد) تو اس طرح ان خطوں میں ایک مستقل جنگ وجدل کا منظر تخلیق کر گئے کہ اہل مشرق اسی میں الجھے ہوئے ہیں۔ ملکوں کی جغرافیائی حدود اور اقوام کی ایک دوسرے سے نفرت۔یورپ میں جرمنی کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا مگر وہ تو اکٹھے ہو گئے مگر مشرق میں ابھی تک یہ آگ برابر جل رہی ہے۔اقبال ان فساد پھیلانے والوں کو طنزاً مصلحین مشرق کہتے ہیں۔

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات!
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سَیر ہیں محکوم کے اوقات!
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

پوری نظم غلاموں کے مزاج کی مختلف صورتوں میں عکاسی کرتی ہے۔ پہلے شعر میں خودی سے دوری موضوع ہے۔ دوسرے شعر میں بھی وہی بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل کو ممولوں جیسی تہذیب دی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ حکمرانوں کے لیے غلام نسل کی کمزور کمتر ممولوں جیسی مخلوق

ہی فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ اگلے اشعار میں آزاد اور غلام کا موازنہ ہے کہ دونوں کے لیے زمانہ اور وقت کئی طرح متضاد اثرات رکھتا ہے۔ دکھ میں تکلیف میں بیماری میں غریب الوطنی میں وقت کاٹے نہیں کٹتا یوں لگتا ہے کہ وقت کی رفتار رک گئی ہے یا دھیمی پڑ گئی ہے۔ آزاد کی زندگی اس کے لیے ہمیشگی کی پیغامبر ہوتی ہے اور غلام ہر لحظہ اچانک مرتا ہے۔ پھر مرتا ہے۔ پھر مرتا ہے۔ بار بار مرتا ہے۔ محکوم ہر وقت مرتا ہے۔ ایک ایک بات پر مرتا ہے۔ ایک ایک مقام پر مرتا ہے۔ آزاد کی فکر ہمیشہ حقیقتوں سے روشن رہتی ہے مگر محکوم کی فکر جھوٹ اور خرافات میں الجھی رہتی ہے۔

محکوم کرامات کا منتظر رہتا ہے کہ اب آج یا کل پرسوں کوئی پیر ظاہر ہوگا اور اپنی کرامات سے محکوم کو غلامی سے نجات دلائے گا مگر آزاد کی زندگی اور عمل بجائے خود کرامات سے بھرا ہوتا ہے۔ آخری شعر میں اقبال انگریزون کے نظام تعلیم کی قلعی اتارتے ہیں جنھوں نے موسیقی مصوری اور باٹنی جیسے علوم میں غلام اقوام کے بچوں کو ڈال دیا۔ ساری نظم میں غلام اور آزاد کا موازنہ ہے۔ غلام اور آزاد کے فکر و عمل کا موازنہ ہے۔ آزاد خود ایک زندہ کرامت ہوتا ہے۔ اس کا فکر مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ آزاد کی زندگی زمانے کی حقیقتوں سے آشنا اور وقت کے طلاطم کی شناور ہوتی ہے۔ محکوم لحہ لحہ مرتا ہے۔ اس کی فکر غلام ہوتی ہے۔ اس کا عمل غلام ہوتا ہے۔ ایک مردہ زندہ لاش کو اٹھائے پھرتا ہے۔ اور انگریزوں نے اس طرح نظام تعلیم ترتیب دیا ہے کہ خودی انا عزت سے غلام قوم کی نوجوان نسل نابلد و نا آشنا ہو چکی ہے۔ فنون لطیفہ میں خوش ہیں۔ یہ یاد رہے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فنون لطیفہ قوم کی اٹھان میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر جب کوئی غلام قوم ان کی اسیر ہو جاتی ہے تو غلام قوم کے لیے یہی فنون لطیفہ غارت گر بن جاتے ہیں۔ بجائے خود فنون لطیفہ مفید ہیں مگر غلاموں کے لیے افیون کا کام کرتے ہیں اور تخلیق اور اختراع کے بجائے تقلید اور کوری تقلید بن جاتے ہیں! سائنسی علوم یعنی علم نباتات بھی پوری طرح نہیں دیا۔ ایک طرف سے دیا تو دوسری طرف سے ایک طبقہ اس کا مخالف بھی محکوموں ہی سے پیدا کر دیا اس طرح آج علم نباتات پر بھی مغربیوں کا ہی اجارہ ہے۔

مرگِ خودی

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

--- محکوموں میں خودی کب باقی رہتی ہے۔(یہ بھی تاریخ کا عجیب سوال ہے) کیا خودی کی موت کے بعد قوم کسی دوسری قوم کی غلامی میں چلی جاتی ہے یا قوم کسی دوسری قوم کی غلامی میں جاتی ہے تو اس کی خودی مر جاتی ہے۔ جب کوئی فرد یا سماج قوت تخلیق واختراع سے عاری ہوتا ہے یعنی اس کی خودی ختم ہوتی ہے تو وہ دوسروں کی غلامی میں چلا جاتا ہے۔ جب کوئی ظالم ان پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ غلام اقوام کے پر کاٹ دیتا ہے۔ جو تھوڑی بہت انا محکوم میں ہوتی ہے اس کو بھی قابض طرح طرح سے کچل ڈالتا ہے۔ اوراس انداز اور طریق سے پر کاٹتا ہے کہ غلام اقوام غلامی میں بھی خوش وخرم رہتی ہے۔ اقبال کی مراد یہ ہے کہ اس طرح اُن کے مزاج کو بدل دیتا ہے کہ شاہبازی کے طریق بھول کر کبوتروں کی طرح پنجروں میں خوش رہنے لگتے ہیں۔ قفس کے عادی پرندوں کے پنجروں کے دروازے کھول دیں تو پنجرے کے آس پاس دو قدم چلنے چگنے کے بعد خود بخود پنجرے کے اندر واپس آتے جاتے ہیں۔ اور یہ صرف کبوتروں پر منحصر نہیں شاہبازوں کو بھی یہ مزاج دیا جا سکتا ہے۔ جب ایک بار وہ قید میں آجائے تو ایسے ہی شاہبازوں کو اقبال کرگسوں میں پلنے والا کہتے ہیں۔ اقبال ہندوستان کے رہنے والوں کو انگریزوں کی غلام کے خوگر دیکھتے ہیں تو نوحہ کناں ہوتے ہیں۔ ہندوستانی غلاموں کی خودی ختم ہو چکی اور اب محکومی ان کے لیے حلال اور آزادی ان غلاموں نے اپنے اوپر حرام کر لی ہے! حلال اور حرام تلازمات خیال کو دور تک لے جاتے ہیں۔

عصرِ حاضر

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!
مُردہ لا دینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اقبال نے مشرق و مغرب کا پوسٹ مارٹم کر دیا ہے۔ مشرق اور مغرب اپنے اپنے پھندے میں گرفتار ہیں۔ ہم صرف آخری شعر کے دوسرے مصرعے کو دیکھیں تو مشرق کی سوچ اور مزاج بے پردہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ غلام مشرق میں بے ربطی افکار ہے۔ نظم و ضبط زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ بے ربطی اور پراگندہ افکار کسی بھی معاملے میں پوری طرح دانش کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ مطالعہ اور فکر کی بے ربطی انسان کو بجائے خود منتشر اور افتراق میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حکمران اسی بے ربطی افکار کو اپنے علوم کے سبب اور بے ربط اور انتشار کا شکار کر دیتے ہیں اس طرح محکوم اقوام میں بیسوں گروہ نمودار ہو جاتے ہیں اور تمام میں سے ہر ایک خود کو حق پر اور دوسروں کو غلط قرار دینے لگتا ہے اس طرح قابض حکمرانوں سے آزادی کی جدوجہد کے بجائے آپس میں دست وگریباں ہونے لگتے ہیں۔ یہ سب بے ربطی افکار کی وجہ سے ہوتا ہے اور حاکموں کی چالاکی سے ہوتا ہے!

افکار کی پختگی نہ افرنگ میں ہے اور نہ مشرق میں نظر آتی ہے۔ عشق اور عقل خام ہے۔ عشق کے خام ہونے سے افرنگ مذہب سے دور ہوتا گیا اور عقل کے خام رہنے سے مشرق غلام بن گیا۔ اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام میں۔ اقبال نے قریباً سو سال پہلے جو دیکھا اور جو سمجھا اس کو بیان کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حاکم کسی ایک نقطہ پر کسی بھی محکوم قوم کو اکٹھا نہیں ہونے دیتے۔ آج کی دنیا آدھے سچ اور آدھے جھوٹ میں سانس لے رہی ہے۔ سوائے سائنس کے پورا سچ کم ہی نظر آئے گا۔ پختہ افکار کو ڈھونڈنے کہاں جایا جائے بہت بڑا سوال اقبال نے سو سال پہلے اٹھایا اور یہ سوال اپنے جواب کا منتظر ہے۔

مدرسہ

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا!
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔شاہین کی تیز نظر اور بلند پروازی آزادوں کے مزاج میں ہوتی ہے۔غلام اقوام کے مزاج چمگادڑوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ چمگادڑ الٹا لٹکتی ہے۔رات کو جاگتی اور دن کو سوتی ہے۔غلام اقوام میں بھی الٹا لٹکنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ الٹا لٹکنا تلامذہ خیال کو کئی جہانوں میں لے جاتا ہے۔ذہن الٹا،فکر الٹی،سوچ الٹی،مزاج الٹا، عمل الٹا اور یہ سب کچھ ہونے کے باوجود خود کو سیدھا سمجھنا۔اس طرح اقبال چمگادڑ کا ذکر کر کے محکوم اقوام کے فکر و عمل کو واضح کرتے ہیں!بڑا المیہ یہ ہے کہ محکوم اقوام کے رہبر، رہنما اور محکوم اقوام کے رہبری رہنمائی کرنے والے ادارے بھی چمگادڑ کی طرح الٹے لٹکے ہوتے ہیں اس لیے انھیں معاملات الٹے نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ان حالات سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں نکال پا رہے۔

غزل

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لیے جہاں میں فراغ

غلام اور آزاد کا موازنہ ہے۔ غلام کے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا اور آزاد کے پاس آرام کے لیے بھی بہت کم وقت ہوتا ہے۔ آزاد سمندروں کی تہوں کو کھنگالنے لگتا ہے۔ زمین کی پاتال میں اتر جاتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں پر چڑھ جاتا ہے۔ پہاڑوں صحراؤں کو کھوجنے لگتا ہے۔ غرض کہ پاتال سے آسماں کے ستاروں تک کوئی چیز اس کی دسترس سے دور نہیں ہوتی۔ آزاد اپنے علم اور عمل سے اس کائنات کی تسخیر میں لگا ہوتا ہے۔ اور محکوم فارغ ہے۔ بیکار ہے۔ محکوم کو کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کے اندر فطرت نے جو صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں۔ بیکار رہنے سے آہستہ آہستہ وہ ختم ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح جو فطری قوتیں انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں وہ بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح وہ دلی اور دماغی طور پر اپاہج ہو جاتا ہے۔ بیکار ہو جاتا ہے۔ آزاد فطرت کی عنایت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے تو وہ اور آب دار ہو جاتی ہیں۔ اور ایک منزل سے اگلی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ مگر محکوم بت کی طرح جامد و ساکت ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کو حرکت دے تو دے وہ خود اپنے آپ کو حرکت دینے سے بھی قاصر ہوتا ہے! ہاں فارغ رہنا بحث مباحثے میں الجھے رہنا اور کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہنا اس کے محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔

نگاہِ شوق

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی!
اِسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند
ہوئے جہاں میں سزا وار کار فرمائی

اگر دنیا کو آنکھ کے ساتھ ساتھ دل بینا اور نگاہ شوق سے دیکھا جائے تو اور رنگ نظر آتا ہے۔

دوسرے شعر میں محکوم اقوام کا ذکر ہے کہ اگر دلِ بینا اور نگاہ شوق سے وہ دنیا کو دیکھیں تو ان کے اندر تبدیلی پیدا ہوگی اور محکومی سے نکلنے کی راہ نکلے گی۔

اہلِ ہُنر سے

روح اگر ہے تری رنج غلامی سے زار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود!
اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیر جنود!

بڑی گہری نظم ہے۔ تخلیق کا معیار فنکار کی سیرت۔ فنکار کا گھرانہ۔ فنکار کا بچپن جوانی کیسے ماحول میں پروان چڑھی۔ تنقید نگاروں کے اہم موضوعات ہیں جب وہ فن پارے کا جائزہ لیتے ہیں تو فن پارہ ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ فنکار اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ فنکار ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور اس کا ماحول اور سماج اور اس دور کے سماجی سیاسی اور معاشی حالات اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ کالونیلزم کا دور بھی ادب کا اہم موضوع رہا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی کالونیلزم کا دور بہت اہم ہے۔ غلام ہندوستان اور اس غلامی کے رنگ رنگ کے اثرات کو اقبال نے اپنے پورے علمی اجتہاد سے موضوع شعر بنایا ہے۔ ان دو اشعار کی طرف آتے ہیں۔ اگر محکوم فنکار کی روح غلامی میں زار و نزار ہو تو پھر فنکار کے فن کی انتہاء۔ یعنی لگی بندھی روایات ہی ہوں گی۔ اقبال کئی اور مقامات پر بھی صوفی اور ملا اور شاعر اور اہل ہنر جو محکوم اقوام سے ہوتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ غلام اور آزاد کے الہام میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اہل ہنر کو بھی محکومی کے اثرات سے بچنے کی راہ بتائی ہے۔

آخری شعر میں جھنجھوڑتے ہیں کہ اگر فنکار اپنے حالات و معاملات سے باخبر ہو تو پھر جن

وانس یعنی زمانے کی طاقت ور طاقتیں اس کی مطیع بن جاتی ہیں۔ پھر فنکار کے سامنے اور آسماں اور جہاں ہوتے ہیں وہ حقیر نہیں ہوتا۔ اقبال ہندوستان کے شعرا۔ ادبا بلکہ تمام فنکاروں کو جگاتے ہیں کہ اے فنکار جس دن تم دل کی رمز سمجھ گئے تو سمجھ لو کہ تمام مرحلہ ہائے ہنر طے کر لیے تم نے۔

فنکار گہری بصیرت سے اپنے فن میں اپنے زمانے کو سمو کر جاوداں کر دیتے ہیں انگریزوں کی حکمرانی اور ہندوستان کی محکومی ہمیں میر کے کلام میں اور غالب کی شاعری اور خطوط میں نظر آتی ہے۔ مورخ جن واقعات کو چھوڑ دیتے ہیں شاعر اپنے فن میں اُن کا ذکر کر دیتے ہیں۔ اقبال کے فن کا مرکز و محور مسلمان ہی ہیں۔ اگر میر، غالب اور اقبال کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو غلامی کی مختلف حیثیتیں اور جہتیں نظر آتی ہیں۔ بہر حال فنکار کا اپنے آپ سے آگاہ ہونا ہی اس کے ہنر کو کمال بخشتا ہے۔ اقبال کے بعد فیض کا مطالعہ اور رخ عیاں کرتا ہے کہ داغ داغ اجالا!

اہرامِ مصر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردان ہنر مند کہ نخچیر!

غلامی کے ہزار رنگ ہیں۔ اقبال فطرت کی غلامی بھی ناپسند کرتے ہیں۔ اگر انسان فطرت کا غلام بن جائے تو رفتہ رفتہ دوسرے انسانوں اور اقوام کا غلام بن جاتا ہے۔ ویسے بھی انسان فطرت کو تسخیر کرنے والا ہے نہ کہ فطرت کا اسیر ہونے والا۔

اقبال فنکاروں کو بھی فطرت کو غلام کرنے والا دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ہنرمندان قوم فطرت کی غلامی سے نکلیں گے تو غلامی کے دوسرے رنگ بھی اتار دیں گے۔ انسان زمین سورج چاند ستارے سب کا شکاری ہے نہ کہ فطرت کا شکار ہے!

فنکار فطرت سے ہمکلام ہوتا ہے اس کی تسخیر کرتا ہے نہ کہ فطرت کا غلام ہوتا ہے۔ اقبال غلام ملک کے فنکاروں، شاعروں، مصوروں، موسیقاروں سب کے سب کو تسخیر فطرت کا درس دیتے ہیں۔ جب فنکار غلامی سے نکل آئیں گے تو ان کی تخلیقات کے سبب سے عام انسان بھی غلامی سے نکلیں گے!

فنونِ لطیفہ

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

اقبال جب ضرب کلیمی کا ذکر کرتے ہیں تو اقبال کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ کر کے ہی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ورنہ ظالم حکمرانوں کے ظلم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مظلوم سمجھتے ہیں کہ اب یہ ظلم سے ہاتھ کھینچ لے گا یہ تاریخ میں نہ ہوا ہے اور نہ ایسا ہونے کی توقع ہے تاریخ میں تمام غلام اقوام نے جنگ لڑ کر آزادی حاصل کی ہے کسی قوم کو بھی خیرات میں آزادی نہیں ملی! غلام اقوام کے مغنی اور شاعر غلام قوم کو ایسے نغمات کا عادی کر دیتے ہیں۔ جن کو سُن پڑھ کر قوم کی قوم سستی۔ کاہلی۔ بے حسی کی عادی ہو جاتی ہے بلکہ مغنی کا نغمہ یا شاعر کا شعر قوم میں موجود سستی کاہلی اور بے حسی کو مستقل کر دیتا ہے حال مست با قاعدہ ایک قدر کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کیونکہ یہ افیونی کیفیت معاشرے میں ایک اہم قدر کی حیثیت اختیار کر چکی ہوتی ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ اس افسردگی اور بے حسی کی کیفیت سے فنون لطیفہ اور ماہرین فن نکلیں گے تو ہی غلام قوم اس محکومی اور بے دلی اور افسردگی کی حالت سے نکل سکے گی۔ چمن کو افسردہ کر دینے والی آواز یا فسوں کسی کا بھی ہو اقبال ناپسند کرتے ہیں۔ اقبال تو ایسی بادِ سحر کے انتظار میں ہیں جو ہلچل پیدا کر دے۔

مصور

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی!
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی!

صحت مند سماج میں علم وادب بھی صحت مند فروغ پاتا ہے۔اقدار بھی زندگی کی حرارت سے فروزاں ہوتی ہیں۔مگر غلامی میں نہ سماج صحت مند رہتا ہے اور نہ ہی فنون لطیفہ میں زندگی کی حرارت اور قوت باقی رہتی ہے۔کیونکہ ماہرین فن بھی غلامی میں پرورش پانے کی وجہ سے رسم ورہ شاہبازی سے نا آشنا ہوتے ہیں۔تخلیقی اور اختراعی قوت ان میں باقی نہیں رہتی وہ صرف اور صرف نقالی میں ماہر ہوتے ہیں۔مقلد اپنی ذہنی قوت اور طاقت سے نابلد ہوتا ہے۔مقلد فطرت کی عنایت کردہ عظیم قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔اقبال ان ہی عظیم خدائی طاقتوں کی موت کا نوحہ الاپ رہے ہیں۔اور یہ موت اتنی عام ہے کہ ہر ایک کی موت ہو چکی ہے۔تخیل کی موت۔تخیل جو فطرت کو تسخیر کرنے والا ہے۔تخیل جو فطرت کو زیر کرنے والا ہے۔اس پر سکوت مرگ طاری ہے تو قوم کس شمار میں آئے گی۔قوم کو جگانے والے ہی تقلید پر فخر کرنے لگیں تو موت کی سنگینی سہ چند ہو جاتی ہے۔ہندی بھی انگریز کے غلام، عجمی بھی انگریز کے غلام، مشرق سارے کا سارا غلام، مشرق کے فنکار غلام، مشرق کی روح تقلید وغلامی میں اپنا سب کچھ کھو چکی ہے۔اقبال نے شاعروں، ادیبوں، مغنیوں کی موت کا ذکر کر کے دراصل مشرق کی روحانی

موت کا نوحہ کیا ہے کیونکہ مشرق فکر اور تخیل سے کام لینے کے بجائے انگریز کی تقلید کر رہا ہے!

یہاں اقبال مشرق کے سرورِ ازلی سے مراد مشرق والوں کا علمی، فکری اور سائنسی علوم میں ماہر ہونا ہے کیونکہ صرف شاعر ہی شعر کی تخلیق کے بعد مسرت سے بہرہ ور نہیں ہوتا ایک سائنس دان بھی کسی نئے نقطے کے حل اور تخلیق پر سرور و مستی میں جذب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مصور بھی اپنی تخلیق کو دیکھتا ہے تو اس کے ہر بُنِ مُو سرشاری سے نہال ہو جاتا ہے۔ اقبال اسی کو سرورِ ازلی کہہ کر مشرق اور عجم کو جھنجھوڑتے ہیں کہ تم میں یہ صلاحیتیں ہیں مگر تم ان کو بروئے کار نہیں لا رہے! فنکار غلامی سے نکلیں گے تو پھر قوم کی قوم غلامی سے نکلے گی۔ اگر فنکار ہی غلامی میں مسرور رہے تو قوم کی قوم غلامی میں لطف لینے لگے گی۔

شاعر

تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لَے!
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

جب کوئی طاقتور قوم طاقت سے کسی قوم کو مفتوح کر لیتی ہے تو پھر وہ اس کے دل کو جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ دل جیتنے کو دوسرے معنوں میں مفتوح کو عزت، انا، خودی سے بے بہرہ کر دیتا ہے۔ حکمرانوں مختلف طریقوں سے مفتوح قوم کو نرم کر کے اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس طرح فاتح جیسا چاہتا ہے مفتوح کو بنالیتا ہے۔ عجمی لَے اقبال نے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سید عابد علی عابد شعر اقبال میں لکھتے ہیں۔

''لیکن اس سے پہلے یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ عجمی لَے یا عجمی شعر گوئی سے کیسا اسلوب شعر گوئی ملحوظ ہے؟ اس کا جواب دراصل اقبال ''اسرار خودی'' میں دے چکے تھے۔ انھوں نے حافظ کو عجمی لَے کا نمائندہ شاعر سمجھا تھا کہ بڑے دل کش اور دل فریب پیرائے میں نرم و نازک الفاظ کی لوری دے کر پڑھنے والے کو موت کی نیند سلاتا ہے۔ یہ موت ذہنی ہے اور ذوق عمل کے فقدان سے عبارت ہے'' غلام اقوام کے لیے تو عجمی لَے اور بھی غارت گر ثابت ہوتی ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ یہ دنیا جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا سے عبارت

ہے چاہے اس کو خاص مفکرین کئی رنگ دیں۔ کمزور روز مرتا ہے۔ تگ و دو جدوجہد اور عمل کی حرارت ہی سے سلطنت ہاتھ آتی ہیں۔ ہاتھ توڑ کے بیٹھ رہنے سے محکومی اور غلامی چھا جاتی ہے۔ آج سو سال بعد بھی اقبال کا فرمان اور واضح انداز میں سامنے آتا ہے۔ چار پانچ ہزار سال کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ علم وادب اور فنون لطیفہ بھی غالب اقوام ہی کے معتبر اور جاندار اور زندگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی غلام اقوام کے اندر سے کوئی ایسا مغنی، ایسا شاعر پیدا ہوتا ہے جو سوئے ہوئے جذبوں، نڈھال و بے حال ذہنوں کی فکر کو حرارت اور عمل دے کر متحرک کر دیتا ہے جو پوری کی پوری قوم کا قومی ترانہ بن جاتا ہے اور پھر غلام قوم آزادی حاصل کر کے ہی رہتی ہے۔ اور دنیا کی حکمرانی بھی بیٹھے بٹھائے جھولی میں نہیں آ گرتی۔ اس کے لیے معرکہ آرا ہونا پڑتا ہے۔ میدان عمل میں اترنا پڑتا ہے۔ شاعر آزادی کے ترانے گائیں گے تو ہر سو آزادی کا نعرہ گونجنے لگے گا۔

مناصب

ہوا ہے بندۂ مومن فسونیٔ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک!
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یارب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک!
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک!

آقاؤں اور غلاموں کے معاملات کو جس عمیق نظر سے اقبال نے دیکھا ہے ہندوستان میں کوئی اور نہیں دیکھ سکا۔ اگر دیکھا تو بیان نہیں کیا۔

نواب زادہ۔ خان زادہ۔ سر۔ شمس العلما۔ فلاں فلاں۔
کبھی کوئی جاگیر عنایت کر دی۔ کبھی کوئی نوکری عطا کر دی۔
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک۔

آج کے دانشور Brain Drain کا رونا روتے ہیں پاکستان سے ذہین لوگوں کو یورپ اور امریکہ اچھی تنخواہوں پر اپنے ہاں بلا لیتے ہیں۔ اقبال بھی نوحہ کناں ہیں کہ غلام اقوام اپنا جوہر ادراک بیچتے ہیں یا بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اچھی تنخواہ۔ اچھا گھر۔ مگر
شریک حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے۔
یہ اچھی تنخواہ اور گھر اور خطاب اور جو کچھ بھی ہے ایک غلام کے لیے ہیں۔ یہ سب کچھ اس

غلام کو آج کی زبان میں Policy maker نہیں بناتے۔ بلکہ حاکموں کے حکموں کو جاری کرنے کے لیے پروپیگنڈے کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کرتے ہیں۔ان آقاؤں کی Policies کولاگوکرنے کا آلہ ہیں۔اس غلامی اور بےتوقیری کو دیکھ کر قلندر کی آنکھ غمناک ہو گئی۔اقبال کی آنکھ میں آنسو اسی وجہ سے ہیں کہ پوری قوم پر فرنگیوں کا جادو چل چکا ہے۔

Ragid بھی فرنگی کے غلام Redicle بھی فرنگی کے غلام اور عوام تو ویسے ہی غلام!

آج بھی ایسے خاندان پاکستان میں موجود ہیں جو انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات اور جاگیروں اور اسناد کو اپنے اور خاندان کے لیے باعث فخر جانتے ہیں اور اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔آج سو سال بعد بھی اپنی خودی کی ہلاکت کا نوحہ کہنے کے بجائے بلند مناصب کو باعث عزت جانتے ہیں۔

نفسیاتِ غلامی

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی، حکما بھی،
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
"بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!"
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

جب کوئی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے تو حکمران اس غلام قوم کے سر کردہ گروہ اور افراد کی خودی کو نرم کر کے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور پھر یہ گروہ اور افراد بے جان اشیا کی طرح ہو جاتے ہیں۔ دانشور بھی شاعر بھی علما بھی تمام کے تمام اپنی قوم کو غلامی پر رضا مند کر لیتے ہیں۔ ان اشعار میں مجموعی طور پر غلاموں کے سر کردہ طبقات کی نفسیات کا ذکر ہے۔ دس بیس کروڑ یا پچاس کروڑ کو غلام بنانا مشکل ہے۔ غلام اقوام میں مختلف طبقات بناؤ اور پھر ان طبقات کے رہنما و رہبر بنواؤ۔ اور پھر ان رہبروں اور رہنماؤں کے ذریعے پوری قوم کو غلام بنائے رکھو!

شیروں کو رم آہو سکھا دینا۔ مطلب یہ کہ سوچ اور انداز زیست کو بدل دینا، روح کو بدل دینا، جسم تو شیر ہی کا ہے مگر اس نے انداز ہرنوں کی طرح کے اپنا لیے ہیں۔ غلام قوم کی فکر

منقلب کر دی جاتی ہے۔ شیر کو شہباز کو ظالم کہہ کر نفرت کی جاتی ہے اور خود پر جو حکمران ہوتے ہیں اُن کی شیری اور شہبازی کا شکار بنا جاتا ہے۔ یہ کام زیادہ تر دانشور طبقہ کرتا ہے۔ علماء کا طبقہ تاویلات کے ذریعے مسائل کا حل اس طرح کرتے ہیں کہ غلام قوم کو غلامی پہ رضامند کرتے ہیں جو تھوڑی بہت آزادی کی رمق اور لگن موجود ہوتی ہے اس کو بھی اپنی تاویلات کے ذریعے سُلا دیتے ہیں۔ یہ کام مذہبی علماء کا طبقہ کرتا ہے۔ شاعروں کو عموماً جذبات کے ترجمان ہی سمجھا جاتا ہے حالانکہ فکر اُن میں موجود ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں فکر ہی فکر نظر آتی ہے حالانکہ سرسری انداز میں پڑھنے سے جذبے کے غالب ہونے کا گمان گزرتا ہے مگر ذرا غور کرنے سے فکر غالب نظر آنے لگتی ہے۔

شاعر، مذہبی علماء اور دانشور اپنی آگاہی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ خودی کی حفاظت نہیں کر پاتے تو اُن کے ہوتے ہوئے قومیں غلام بن جاتی ہیں تو اقبال کی نظر میں شاعر، علماء اور دانشوروں کی کہیں نہ کہیں کوتاہی نظر آئے گی۔ اگر یہ تینوں طبقات صحت مند ہوں تو کبھی بھی کوئی قوم غلام نہیں بن سکتی۔ مقبولیت اور ناکاری پہلے ذہنی طور پر کسی سماج کے سرکردہ طبقات اور شاعروں، ادیبوں اور علما و فقہا میں پیدا ہوتی ہے اور ان کے زیر اثر سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اب غلامی سے نکلنے کی راہ بھی یہی ہے کہ یہ سربرآوردہ طبقات غلامی سے نکلنے کے لیے تیار ہوں!

خواجگی

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی!
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

اس نظم میں اقبال خواص کے ساتھ عوام کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان سینکڑوں صدیوں سے غلام ہے۔ آریاؤں نے مقامی دراوڑوں کو غلام بنایا۔ داس بنالیا۔ اور پھر مذہبی رنگ دے کر غلام کو ذہنی آسودگی دینے کے لیے دیوداس کا نام دے دیا۔ آریا کے بعد مختلف ادوار میں ایرانی، یونانی، شاکا یوچی اور ہُن حملہ آور ہوئے پھر سلاطین آئے اور آخر آخر مغل آئے اور پھر انگریزوں نے تمام ہندوستان کو غلام بنالیا۔ اس طرح یہاں کے عوام غلامی کے خوگر بن گئے عادی ہو گئے اور اپنے آپ کو داس سے دیوداس کہہ کر خوش ہونے لگے۔ اس طرح آج مسلمانوں میں بھی غلام نام کافی تعداد ہے۔ غلام اللہ اور غلام رسول تک تو قابل فخر ہے جب چھوٹے چھوٹے پیروں فقیروں کی غلامی پر فخر کیا جانے لگا۔ اسی کی طرف اقبال کا خطاب ہے کہ غلامی بجائے خود ایک خوبی اور قابل عزت چیز سمجھی جانے لگی۔ مختلف انداز کی پگڑیاں، مختلف رنگوں کی ٹوپیاں اور کپڑے اور جوتے اور بالوں کے انداز سے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم فلاں

کے غلام ہیں۔غلامی میں پختہ ہو جانے والی قوم پر حکمرانی مشکل نہیں رہتی۔

دور حاضر حقیقت میں وہی عہد قدیم، اقبال نے سات آٹھ ہزار سال کی تاریخ بیان کر دی۔اس میں پیروں کا کوئی کمال نہیں ہے۔ ہزاروں سال سے غلام رہنے کی وجہ سے غلامی کے عادی بن چکے ہیں۔قدیم ادوار میں بھی اہل سجادہ اور اہل سیاست ہی قوموں کے حاکم رہے ہیں اور آج بھی ایسے ہی ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو آج کا دور بھی عہدِ قدیم ہی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ حاکموں کا انداز وہی عہد قدیم والا ہی ہے اور محکوم بھی داس ہی ہیں۔ داس، دیوداس، دیوداسیاں۔ سینکڑوں صدیوں کے غلاموں کو جگاتے ہیں، اٹھاتے ہیں، انسانیت کی تذلیل نہیں دیکھ سکتے! ان اشعار میں اقبال انسانی تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ صدیوں کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ یہاں اقبال مسلمانوں تک محدود نہیں رہتے۔

غلاموں کے لیے

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لیے ہے اکسیر!
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو،
ہوتے ہیں پختہ عقاید کی بنا پر تعمیر!
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقاید سے تہی جس کا ضمیر

مشرق ومغرب کی دانش وعلم نے غلاموں کے لیے ایک نکتہ سکھایا جو غلاموں کو غلامی سے نکال سکتا ہے۔وہ ہے عقاید کی پختگی۔

دین ہو۔فلسفہ ہو۔فقر ہو۔سلطانی ہو۔

یہاں اقبال نے دین اور فلسفہ کو اور فقر اور سلطانی کو ایک صف میں رکھا ہے۔کہ غلامی میں ان تمام کے لیے ایک ہی نکتہ اکسیر ہے کیونکہ یہ تمام کے تمام غلامی میں پختہ عقاید سے تہی دست ہو جاتے ہیں۔دانشور ڈور سلجھانے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں مگر خود دانش میں پختہ نہیں ہوتے۔غلامی میں فقر والوں کی جو صورت بن جاتی ہے اقبال نے کئی رنگ میں دکھایا ہے۔اور حکمران بھی عزت انا غیرت سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔ان کی فکر میں عمل میں پختگی نہیں رہتی۔

مرکزی نقطہ یہی ہے کہ پہلے تو اپنے عقاید میں پختگی ہونی چاہیے اور یہ پختگی علم اور کردار

سے آتی ہے۔ جب عقاید پختہ ہوں تو غلام غلامی سے نکل آتے ہیں۔ جب عقاید میں پختگی نہ ہو تو دین میں تاویلات ہونے لگتی ہیں۔ فلسفہ میں روباہی آ جاتی ہے۔ سلطانی میں عیاری ہونے لگی ہے۔ فقر میں بھی عیاری در آتی ہے۔ اس طرح یہ مکاتیبِ فکر و عمل اپنے مقام سے لڑھک جاتے ہیں۔ ان کے کلمات میں سوز نہیں باقی رہتا اور ان کا عمل بھی زار و زبوں ہوتا ہے۔ عقاید جب خام رہتے ہیں تو یہ طبقات بھی زوال پذیر ہونے لگتے ہیں۔

ابلیس کا فرمان
اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دَیرِ کہن سے نکال دو!
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

غلاموں کی کایا کلپ کر دو۔ ان کی فکر لے لو۔ ان کی تہذیب چھین لو۔ ان کی روایات چھین لو۔ ان کی روح بدل دو۔ بدن ان کا ہو روح حکمرانوں کی فرنگی کی مرضی کی۔ اقبال نے

بڑے عمیق اور بسیط انداز میں حکمران غلاموں سے جو کچھ کرتے ہیں اس کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔غلاموں کو دین اور تہذیب سے برگشتہ اور متنفر کر دو۔اور ان کو اپنی تہذیب اور روایات سے دور رکھو!

اس طرح یہ غلام غلامی میں خوش رہیں گے بلکہ لطف لیں گے۔

البتہ اقبال کی غزل سرائی سے ڈر ہے کہ مبادا سارے چمن یعنی غلام ہندوستان جوش عمل میں نہ آجائے اس لیے اقبال کو چمن سے نکال دو۔لالے کی آگ تیز۔اقبال کے نغمات کا اثر ہو رہا ہے لوگ خواب سے نکل کر انگڑائیاں لے رہے ہیں۔دراصل اقبال غلاموں کو بتاتے ہیں کہ جو کچھ تم سے چھینا گیا ہے اسی زیور اور ہتھیار کو دوبارہ اٹھاؤ تو غلامی سے نجات دور نہیں!

برہمن ہندوؤں کو اُن کے مذہب سے دور کر کے سیاست میں الجھا دو۔مسلمانوں کے اندر سے روح محمدؐ نکال دو۔عربوں کو فرنگی تخیلات دے کر اسلام کو یمن اور حجاز سے نکال دو۔افغانوں کو اپنے مذہبی رہنماؤں، ملاؤں (باکردار اور باعمل ملا مراد ہیں) سے دور کر دو۔اور اہل حرم سے اُن کی روایات چھین لو۔اقبال نے فرنگیوں کی سیاست واضح کر دی ہے۔آج سو سال بعد انگریزی اور امریکہ یہی کچھ کر رہے ہیں۔اور پوری دنیا کے مسلمانوں پر زندگی مشکل کی ہوئی ہے۔اور پھر مسلمانوں کے اندر سے ہی فرنگی کو آلہ کار مل رہے ہیں۔اقبال کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا! یہ سب ابلیس اپنے سیاسی غلاموں کو طریقے بتا رہا ہے۔

جمعیتِ اقوام مشرق

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلک پیر بدل جائے!
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے!
طہران ہو گر عالم مشرق کا جینوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

پہلی جنگ یورپ کے بعد یورپی اقوام نے ایک جمعیت تشکیل دی اور اس کا ہیڈ کوارٹر جینوا میں بنا۔ مگر دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ دوسری جنگ کے نتائج محکوم اقوام کے لیے بڑے غارت گر تھے۔ مختلف ملکوں کو بڑی حکمران اقوام نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ یورپ نے مشرق پر حکمرانی کا خواب دیکھا ہے یہ اقبال سمجھ رہے تھے کہ یورپ کسی طرح بھی مشرقی اقوام کو غلامی سے نکلنے نہیں دے گا۔ مگر نگاہ فلک پیر کے بدل جانے کے بھی امیدوار ہیں کہ شاید مغربی اقوام نے جو خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر بدل جائے۔

مگر اس کے لیے مشرقی اقوام کو اپنی ایک تنظیم بنانا ہوگی اور اس کا مرکز اگر طہران ہو تو کیا خوب ہے!

مگر افسوس! اقبال کے سو سال بعد بھی مشرقی اقوام خواب غفلت سے نہیں جاگیں اور مغرب نے بھی کئی رنگ اور انداز میں مشرقی اقوام اور خاص طور مسلمان امت کے رہبر اور

رہنماؤں کو طرح طرح سے یرغمال بنایا ہوا ہے۔ آج بھی مشرق کے غلام حکمرانوں کی دولت حکمران مغرب کے بینکوں میں پڑی ہے۔ اس دولت سے فائدہ مغرب اٹھا رہا ہے۔ مشرق سسک رہا ہے۔ اور مغرب پل رہا ہے مشرق کا خون پی پی کر۔ اور سب کچھ مقامی حکمرانوں کی وساطت سے ہو رہا ہے۔ آج مناصب بدل گئے ہیں۔ کوئی وزیر اعظم، کوئی سفیر، کوئی کچھ اور کوئی کچھ ہے!

یہاں اقبال مشرقی اقوام کا ذکر کرتے ہیں۔ قریب قریب سارا مشرق کسی نہ کسی رنگ میں غلام ہی تھا۔ مشرقیوں کو ایک مرکز بنانے اور ایک مرکزی نقطے پہ اکٹھے ہو کر ہی اس محکومی سے نکلنے کا حل بتاتے ہیں۔ اس کے لیے طہران تجویز کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے۔

یورپ اور سوریا

فرنگیوں کو عطا خاک سوریا نے کیا!
نبی عفت و غم خواری و کم آزاری!
صِلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و قمار و ہجوم زنان بازاری!

اقبال: جس ملک شام کا ذکر کر رہے ہیں وہ موجودہ فلسطین مسلمان و یہودی علاقہ، اردن کا مشرقی بڑا حصہ اور لبنان اسی ملک میں شامل تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملکوں کی حدود کا تعین بڑی طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ اور کمزور ملکوں کے نقصانات اور تضادات کو مستقل کرنے کی بنا پر کیا۔ اس نظم کا موضوع بھی محکومی غلامی اور کالونیلزم ہی ہے۔ اور غیر ملکی آقا کس طرح محکوم ملکوں کے تمدن اور روایات اور عادات بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کا بیان اقبال کر رہے ہیں۔ فرانس اور انگلینڈ یورپ کی بڑی طاقتیں تھیں اور زیادہ کالونیوں پر ایشا اور افریقہ میں ان ہی کا قبضہ تھا۔ ان کے بنائے ہوئے قضیے ابھی تک افریقہ اور ایشیا کے محکوم ممالک بھگت رہے ہیں اور انھیں ابھی ہوش بھی نہیں آیا۔

بے شک اسی مختصر نظم میں محکومی غلامی کا لفظ نہیں آیا مگر محکوموں کی روایات اور مذہب اور سیاست اور معیشت کو کس طرح حکمران تباہ و برباد کر دیتے ہیں وہ واضح ہے!

مسولینی

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج!
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے، نہ راج
آل سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج!
پردہ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال بات سمجھانے کے لیے خاص حوالے لاتے ہیں مگر عمومی نتائج کا استخراج کرتے ہیں۔ مقامی ظالم ملوک بھی غیر ملکی قابض حکمرانوں ہی کی طرح ظلم کرتے ہیں۔ فاتح مفتوح اقوام پر ظلم کرتے ہیں اور یہ سب کچھ تہذیب کے پردے میں ہوتا ہے۔

پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی۔ غیر ملکی قابض مفتوح اقوام کو نفرت اور حقارت سے گورے اور کالے کا فرق ہندوستان میں سینکڑوں صدیاں بیشتر آریاؤں نے کیا تھا۔ آریا گورے مہذب دیوتاؤں کی اولاد۔

کالے دراوڑ چپٹی ناک والے غلام داس۔ خدمت گذار۔ اجڈ اور اس تقسیم کو کئی صدیوں بعد انگریزوں نے دہرایا۔

کالوں اور کتوں کا داخلہ بند، کالے اندر نہیں آسکتے۔

انگریز مہذب ہے تعلیم یافتہ ہے۔

کمزور کو طاقتور لوٹ لیتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے مقامی راجوں کو ذلیل و بے حقیقت کر دیا۔ تضحیک کے انداز میں راج اور راجدھانی اور راجہ کا لفظ باقی رکھا۔

خانِ ساماں انگریزوں سے پہلے بہت بڑا عہدہ تھا انگریزوں نے تضحیک کرتے ہوئے باورچی کو خانساماں بنا دیا۔

صوبہ دار۔ صوبے کے حکمران کہا جاتا تھا مگر انگریزوں نے فوج میں عام عہدہ بنا دیا۔

کلف والے کپڑے اور طرہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے پہناوے تھے

مگر

انگریزوں نے ہوٹل کے بہروں اور گھر کے نوکروں کو پہنا دیے۔

انگریزوں کے دور میں جب کوئی مقامی ہندوستانی (اپنے طور سے بڑا آدمی) کسی انگریز آفیسر سے ملنے جاتا تو اس افسر کے نوکر اور مقامی راجے کا لباس ایک جیسا ہوتا تھا۔

انگریزوں نے معاشی طور پر ہندوستان کو دیوالیہ کر دیا۔ خام مال یہاں سے تقریباً مفت انتہائی کم قیمت میں لے جاتے پھر تیاری کے بعد مقامی مارکیٹ میں سینکڑوں گنا اضافے میں

محکوم اقوام کو دیتے۔

فاتح حکمران مفتوح اقوام سے نہ صرف حکومت بلکہ دولت اور مال چھین کر بھکاری بنا دیتا ہے قبضہ در حقیقت مال و دولت ہی کے لیے کیا جاتا ہے مگر نعرہ تہذیب سکھانے کے لیے آئے ہیں ہی ہوتا ہے۔

اقبال کے سو سال بعد ایڈورڈ سعید نے ہم اور تم۔ ہم اور وہ کے فرق کو واضح کیا ہے!

اقبال کئی رنگ اور انداز میں اپنے شعر میں بتا چکے ہیں!

گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے!
جاں بھی گرو غیر ' بدن بھی گرو غیر!
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے!
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

تاج برطانیہ کے زیر نگیں ہندوستان ایک روشن نگینہ ہے بیچارہ۔ بیچارہ سے تاج برطانیہ کے زیر نگیں بسنے والوں کی بے بسی اور بے کسی عیاں ہے۔

تاج برطانیہ کے زیر نگیں کسانوں کی حالت قبر کے اُگلے ہوئے مردے کی طرح ہے۔ اس کے تن پر کپڑہ نہیں۔ جان بھی اور بدن بھی تاج برطانیہ کے پاس گروی پڑا ہے۔ اس کی روح بھی مر چکی ہے۔ جان بھی نکل چکی ہے۔ بدن بھی بوسیدہ ہے۔

اقبال تاج برطانیہ سے گلہ نہیں کرتے بلکہ تاج برطانیہ کے زیر نگیں رہنے والے محکوم لوگوں سے گلہ کرتے ہیں کہ تم غلامی پہ رضا مند ہو۔ جب کوئی قوم اپنے آپ کو کمزور سمجھ لیتی ہے۔ خودی سے خود کو محروم کر لیتی ہے۔ انا باقی نہیں رہتی۔ تو طاقت ور اس کو غلام بنا لیتا ہے۔

اقبال اسی لیے ہندوستانیوں سے گلہ کرتے ہیں کہ جو قوم اپنے جوہر باقی رکھتی ہے ان کی رکھوالی کرتی ہے۔ان میں بہتری لاتی رہتی ہے تو کوئی دوسرا اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔اور اگر قابض ہو بھی جائے تو بہت جلد اس کو نکال باہر کرتے ہیں مگر اقبال دیکھ رہے ہیں کہ مقامی محکوم لوگ تاج برطانیہ کو نعمت خداوندی قرار دے رہے ہیں۔اور اس غلامی میں خوش ہیں۔رضامند ہیں تو اقبال یہ گلہ کرتے پھر جھنجھوڑتے ہیں کہ خرابی تمھارے اپنے اندر ہے!

انتداب

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روحِ ناشکیب و عمیق
طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پر دم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر ورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

جب ہندوستان میں ہندوستان چھوڑ دو کے نعرے بلند ہونے لگے تو انگریزوں نے یہی کہا کہ تم یعنی ہندوستان والے حکومت سنبھالنے چلانے کے اہل نہیں جب تم اس کے اہل ہو جائے گے تو تب ہم چلے جائیں گے۔

اسی دوران میں مقامی محکوم اقوام میں کئی لوگ یہ نعرہ لگاتے تھے کہ انگریزوں کو ابھی ہندوستان سے نہیں جانا چاہیے کہ اس طرح ترقی اور تہذیب کا سفر رک جائے گا۔ پہلے شعر اور آخری شعر میں اقبال نے غیر ملکی آقاؤں کے طریقہ واردات کی قلعی اتار کر رکھ دی ہے۔

تہذیب کے لبادے میں ننگی جارحیت اور غارت گری واضح کردی ہے۔ درمیاں کے اشعار میں مشرق اور مغرب کے طرز زندگی کا موازنہ کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کن کن بہانوں سے کس کس طرح انگریزوں نے ملکوں کو اپنے قبضہ میں کرلیا اور پھر ان محکوموں کے طرز زندگی کو بدل دیا۔ اپنی تہذیب کو مہذب اور شائستہ سمجھتے ہیں۔ مگر ان ہی مہذب اور بظاہر شائستہ اطوار ڈاکوؤں نے اس طرح محکوم اقوام کو لوٹا ہے کہ اب تک محکوم ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو پائے۔ اور سیاست اور مذہب میں اپنے پرورده لوگ چھوڑ گئے ہیں اور وہ بھی غیر ملکی آقاؤں کی طرح مقامی لوگوں سے برتاؤ کرتے ہیں۔ مقامی بیوروکریسی اور نوکرشاہی کو ایسا مزاج عنایت کر گئے ہیں کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو انگریز سرکار کے نوکر سمجھ رہے ہیں۔ یہی ہے قائم مقامی بے شک جب یہ نظم لکھی گئی انگریز ابھی ہندوستان میں موجود تھے مگر ان کے انداز حکمرانی سے اقبال جان چکے تھے کہ انگریزوں نے اپنے قائم مقام تیار کر لیے ہیں۔

ایک تو انگریز خود بطور قائم مقام ملکوں پر قابض ہوئے۔ ہندوستان میں ایک راجہ کے قائم مقام ہوئے پھر دوسرے کے اور پھر سارے ہندوستان کے۔ کہیں پر صرف دیوانی معاملات سنبھال لیے۔ کئی ڈھنگ سے انگریزوں نے قائم مقامی حاصل کی اور آخر اختیار کلی حاصل کرلیا۔

مگر جاتے جاتے اپنے تربیت یافتہ سیاست دان۔ مذہبی رہنما، نوکرشاہی اور افسران فوجی وسول اپنے قائم مقام چھوڑ گئے۔ اقبال کی عمیق اور دوررس نظر فکر دیکھ رہی تھی کہ انگریز کس طرح جہاں جہاں حکمران ہوئے ہیں انھوں نے مقامی اقوام کے طرز فکر اور سوچ اور طرز زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ تہذیب کے پردے میں تخریب کا عمل جاری ہے!

دامِ تہذیب

اقبال کو شک اس کی شرافت مین نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار!
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار!
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار!
ترکان 'جفا پیشہ' کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار!

عنوان ہی سے منافقت ظاہر ہے۔ اقبال قول اور فعل کے تضاد کو واضح کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال نے صوفی ملا کی قلعی اتاری ہے۔ اقبال بگلے کو بھگت کے روپ میں دیکھتے ہیں تو چپ نہیں رہ پاتے۔ رہبر کو رہزن دیکھ کر پکارنے لگتے ہیں۔ ڈاکو کو تہذیب کے لبادے میں دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں۔

جب عرب ترکوں کے زیر اثر تھے تو یورپ والے کہتے تھے ظالم ترکوں نے عربوں کو غلام بنایا ہوا ہے۔ پہلی جنگ میں یہ عرب ملک آزاد ہو گے آزاد کیا ہوئے شام پر فرانس نے قبضہ کر لیا اور فلسطین کو برطانیہ نے اپنے قبضہ عاطفت میں لے لیا۔ ترکوں کے قبضے میں تھے تو مظلوم کہہ کر یورپی ان کی مدد کو آئے اور اس مدد امداد کے پردے میں قابض ہو گئے۔ ترک تو ظالم تھے مگر اب مہذب انگریزوں کے قبضے میں ہیں۔ آخری مصرعے میں

بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

اقبال نے سینکڑوں صفحوں کا مقالہ لکھ دیا ہے۔

آج پھر سو سال بعد شام پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بمباری ہو رہی ہے!

نصیحت

اک لُردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر!
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
برّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر!
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر!
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

تیسرے شعر میں اس کرشمے کا بیان ہے جو انگریزوں نے ہندوستان میں کیا۔ انگریزوں نے جو نصاب تعلیم ہندوستان میں رائج کیے وہ فکر کے بجائے جذبے کو انگیخت کرنے والے تھے۔ معاشی اونچ نیچ اور سماجی طبقاتی نظام کی بیخ کنی پر مبنی نہ تھے کہ فکر کو تحریک دیتے۔ ہندوستان میں سائنسی فکر کو انگریزوں نے پروان نہیں چڑھنے دیا۔

ایک انگریز لارڈ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ کس طرح ملوکیت قائم رکھی جا سکتی ہے۔ بھیڑ کے بچے کو شیر کی زندگی کے اصول نہ بتاؤ۔ اپنے ترکش کے تیر ظاہر نہ کرو، ملوکیت کی

وارداتیں راز رہیں تو بہتر ہے۔ محکوموں کو ملائم کر لو پھر جدھر مرضی ادھر موڑ لو۔ اس طرح یہ سونے کا پہاڑ ایک مٹی کے ڈھیر کی صورت اختیار کر جائے گا۔ اور شاید انگریز لارڈوں کے بچے کوّے کے بچے کی طرح سیانے ہیں!

ایک حاکم اپنے بیٹے کو غلاموں کو مستقل غلامی رکھنے اور اپنی حاکمیت کو دیرپا رکھنے کے گُر سکھا رہا ہے اور حاکم کا بیٹا سیکھ رہا ہے۔ اقبال کی وفات کے بعد آج بھی مشرق پر مغرب حاکم ہے۔ مغرب ہی کی معاشی اور سیاسی پالیسی جاری ہے۔ امریکہ اور مغرب مل کر اقوام مشرق پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ فرنگیوں کے بیٹے اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ سیانے نکلے ہیں اور اقوام مشرق آج بھی بُرے حالوں میں ہے۔ ہاں اقوام مشرق کے سیاسی اور مذہبی لیڈر لطف سے بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔

نفسیاتِ غلامی

سخت باریک ہیں امراضِ اُمَم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیان کوتاہی!
دین شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوتِ فرعون کی درِ پردہ مرید!
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی

ان تین اشعار میں اقبال نے امت مسلمہ اور خصوصاً غلام ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کی ذہنی غلامی اور اس غلامی کے اثرات کا ذکر فرمایا ہے۔ لفظ باریک میں اقبال نے نظر نہ آنے والے مضر اثرات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ غلاموں کی فکر اور فعل کس طرح کے ہو جاتے ہیں اور پھر غلام اقوام کس طرح اپنے غلط سے غلط فعل اور سوچ اور فکر کے لیے طرح طرح کی Jestifiations پیدا کر لیتی ہے کا اظہار ہے اور اقبال جیسا شاعر بھی بیان کی کوتاہی کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ غلام قوم متنوع بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ غلاموں کے افعال تضادات سے بھرے ہوتے ہیں۔ غلامی کے اثرات نے ان کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا ہوتا ہے۔ آخری شعر زیادہ غور طلب ہے۔ در پردہ۔ اس میں اقبال نے ام الامراض کی نشاندہی کی ہے۔ فرعون کی غلامی سے حضرت موسیٰ نے قوم کو نجات دلائی کیونکہ در پردہ بھی اور کھلے بندوں بھی حضرت موسیٰ فرعون کی فرعونیت کے خلاف تھے۔ مگر اقبال فرماتے ہیں کہ اگر غلام قوم کو غلامی سے نجات

دلانے والے موجودہ فرعون سے لڑنے والے در پردہ۔ خفیہ طور پر فرعون کے مرید ہوں غلام ہوں تو پھر ایسے لیڈر جو غلامی کے خلاف لڑنے کا سوانگ رچائے پھرتے ہوں تو ایسے رہبر اور لیڈر قوم کے لیے لعنت بن جاتے ہیں۔

غلام اقوام کے امام اور شیوخ وقت اور زمانے کا بہانہ بنا کر جرات مندانہ کردار چھوڑ کر لومڑی کی مکاری کا کردار اپنا لیتے ہیں۔ اور دراصل ایسے امام اور شیوخ اپنی قوم سے مکاری کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر ظاہر ایسے کرتے ہیں کہ وہ آقاؤں کو چکر دے رہے ہیں اور فلسفیانہ اصطلاحوں سے کام لے کر اپنے آپ اور اپنے افعال کو حق بجانب قرار دینے کی مکارانہ کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کے دور میں انگریز کی حکمرانی تھی اور غلام ہندوستان کے رہبر اور لیڈر انگلستان کے خلاف زیادہ بولتے تھے۔ آج ہمارے لیڈر اور امام امریکہ کے خلاف زیادہ ہو گئے ہیں۔ مگر اقبال نے در پردہ قوت فرعون کے مرید ہونے کا ذکر کر کے سیاسی شطرنج کی چالوں کو واضح کیا ہے۔ غلام اقوام میں منافقت در آتی ہے۔ کمزور اور نااہل بھی منافقت پر اتر آتا ہے۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جو شہد سے مر جائے اسے زہر کیوں دیا جائے جیسے دانشورانہ فرمان منافق اقوام ہی میں سامنے آتے ہیں۔ رسول کریم کو مکہ میں کھلے دشمنوں سے واسطہ تھا مگر مدینے میں منافقین سے اور عبداللہ بن ابی سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ قرآن کریم میں جہاں مومنین سے، مسلمین سے، ایمان والوں سے اور کافروں سے خطاب ہے وہاں منافقین سے بھی۔ منافق سماج میں بہتری پیدا کرنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ اقبال رہبروں کی منافقت کی قلعی اتارتے ہیں۔

غلاموں کی نماز

(ترکی وفد ہلال احمر لاہور میں)

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام!
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام!
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام!
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
وُرائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام!
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام!

ایک خاص واقعہ سے اقبال نے غلام اور آزاد کے فعل کو بیان کر دیا ہے۔ ترکی آزاد تھا اپنی آزادی برقرار رکھنے کی تگ و دو میں تھا۔ ہندوستان غلام تھا یہاں کے مسلمان غلام تھے۔ بادشاہی مسجد میں نماز کی ادائیگی کے بعد ترکی مجاہد نے مومن آزاد نے اقبال سے پوچھا کہ

تمھارے امام کیوں طویل سجدہ میں؟

اقبال غلاموں اور آزادوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ دنیا میں آزاد اقوام ہی کے ذوق عمل سے ملکوں اور قوموں کے نظام قائم ہیں بلکہ دنیا پر مردان حُر ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ مگر غلاموں کا بدن سوز عمل سے محروم ہوتا ہے اور غلام کے لیے دن رات برابر ہوتا ہے۔ اقبال نے بدن اور سوز عمل سے محرومی کا ذکر کر کے دراصل غلاموں کے فکر اور سوچ اور عمل سے تہی دامن ہو جانے کا اظہار فرمایا ہے۔ کیونکہ عمل ہی فکر کا عکاس ہوتا ہے۔ جس کی فکر پژمردہ ہو گئی۔ اس کے لیے وقت رُک گیا۔ کائنات تھم گئی۔ دن رات ایک ہو گیا۔ روشنی اندھیرے کی تمیز ختم ہو گئی۔

آخری سے پہلے شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ طویل سجدوں کے علاوہ ان کو کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔ دنیا کے زمام کار تو انگریزوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس لیے ہر پل ان کی دنیا پر نظر ہے کیونکہ وہ دنیا کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتے ہیں۔ آخری شعر میں اقبال دعا کرتے ہیں کہ ہند کے اماموں کو ایسا سجدہ نصیب کرے جس سجدے میں زندگی کا پیام ہو۔ ایک اور جگہ بھی اقبال ایسے سجدے کی آرزو کرتے ہیں جو ہزار سجدوں سے نجات دے۔ یہاں بھی اقبال زندگی کا پیام دینے والے سجدے کے آرزومند ہیں۔ جس کے اندر ملت کی زندگی کا پیام پوشیدہ اور واضح ہو۔

فلسطینی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے!
تری دوا نہ جینوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے!
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے!

پہلے دو اشعار میں تو فلسطین عربوں اور یہودیوں کا ذکر ہے۔ مگر تیسرے شعر میں عمومی فلسفہ پیش کیا ہے۔ غیر ملکی حکمران یا آقا سب سے پہلا کام یہی کرتے ہیں کہ غلاموں کو خودی سے عزت سے وقار سے بے بہرہ کر دیتے ہیں۔ غلاموں کی انا کو مسل دیتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر غلام اپنی خودی کی حفاظت کرتے رہیں پرورش کرتے رہیں یعنی خودی کے احساس کو بڑھاتے رہیں اور ان کے اندر لذت نمود موجود ہو تو غلامی سے نجات ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

لذت نمود بڑے وسیع معنوں میں اقبال نے استعمال کیا ہے۔ بلکہ غلام ہندوستان کے مسلمانوں میں مروج خاص فکر کے بالکل الٹ استعمال کیا ہے کیونکہ غلام ہندوستان میں عام تو عام خواص بھی لذت نمود سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ لذت نمود کو نمود و نمائش سے منسلک کر کے اس سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ اقبال دور غلامی سے نکال کر آزاد دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔

خودی اوراس کی مسلسل پرورش اورلذت نمود ہی غلاموں کوغلامی سے نجات دلاسکتی ہے!

ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر نُمود کے برعکس فنا کا تصور بلکہ فکر عام ہوگئی۔اپنے آپ کو چھپانا بھی ایک مزاج تھا۔

اس کے اثرات سماج میں کئی کئی انداز سے ہوئے۔ان اثرات کو دور کرنے کے لیے ہی اقبال نے خودی کا درس دیا۔خودی کی پرورش اور لذت نمود میں جو سرشاری ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بلھے شاہ کے مصرعے میں بھی لذت نمود ہے۔مگر عوام الناس نے اس کا اور مطلب لیا۔

نہ کوئی اساڈی ذات پچھانے نہ کوئی اسانوں منے

مشرق ومغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری!
نہ مشرق اس سے بری ہے، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری!

مشرق کی بربادی غلامی اور تقلید ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قلب ونظر میں وہ زندہ تمنا نہیں جس کی اقبال دعا مانگتے ہیں۔ قلب ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پہلے مصرعے میں غلامی اور تقلید کو مشرق میں بیماری کا سبب قرار دیا ہے۔ غلاموں اور نقالوں سے تخلیقی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ اقبال اہل مشرق کی تباہی کا سبب غلامی اور تقلید قرار دیتے ہیں!

نفسیاتِ حاکمی

(اصلاحات)

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری!
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری!

پرانے وقتوں کے آقا اور طرح کے ظالم تھے۔ مگر مہذب زمانے کے مہذب آقا اور طرح کے ظالم ہیں۔ آقا ظلم بھی کرتے ہیں تو اس کو کوئی اور نام دیتے ہیں۔ لوٹتے ہیں لٹیرے نہیں کہلواتے۔ ظلم کرتے ہیں ظالم نہیں کہلواتے۔ ہندوستان میں انگریزوں کا یہی نعرہ تھا کہ غیر مہذب لوگوں کو مہذب بنانے آئے ہیں۔ جب یہ مقامی لوگ اپنے آپ پر حکومت کرنے کے قابل ہو گئے ہم ہندوستان ان کے حوالے کر کے نکل جائیں گے۔ آہستہ آہستہ اِن کو طرز حکمرانی سِکھا رہے ہیں سیاسی اصلاحات اور معاشی اصلاحات کے دلفریب نعروں سے مقامی غلاموں کو بہلاتے رہے۔ جس طرح صیاد پنجرے میں مرجھائے ہوئے پھول رکھ دے کہ اسیروں کو ایسے محسوس ہو کہ وہ چمن میں ہیں۔ میں نے جو نغمے آزادی کے گائے وہ میرے کام نہ آئے۔ رحم دل آقا ظالم آقا سے زیادہ ظالم ہوتا ہے کہ اس کے منافقانہ رویے کی وجہ سے مظلوم کے دل میں آزادی کی خواہش جنم ہی نہیں لیتی۔ یہی حاکموں کا طریقہ واردات ہے کہ مظلوموں کو اپنی مظلومیت کا غلاموں کو اپنی غلامی کا احساس نہیں رہتا۔ حاکموں کے نفسیاتی حربوں کا ذکر ہے۔ اقبال نے نفسیاتی اصطلاحات کے بغیر ہی غلام افراد غلام اقوام اور حاکم اقوام کے نفسیاتی جائزے لیے ہیں۔

محراب گل افغان کے افکار

اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہن چاک چاک!

خلعت ۔خطاب۔عہدہ۔کئی انداز ہیں غلاموں کو غلامی پہ ناز کرنے کے لیے آج بھی لوگ اپنی خاندانی اور وراثتی بڑائی بیان کرنے کے لیے ان باتوں کا اظہار فرماتے ہیں کہ میرے دادا انگریزوں کے دور میں فلاں عہدے پر تھے۔انھیں فلاں خطاب ملا تھا۔انھیں یہ ملا تھا انھیں وہ ملا تھا۔اقبال محراب گل کی زبان سے ایسے انعام یافتہ خطاب یافتہ اور خلعت یافتہ اور اس پہ نازاں افراد کا ذکر کرتے ہیں۔ایک غیور فرد کیا انگریزوں کے عطا کیے ہوئے خلعت پہ خوش ہوگا یا چاک پیرہن میں خوش رہے گا۔ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔درمیانی راستہ کوئی نہیں۔

○

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

یہاں اقبال نے غلام کا لفظ تو استعمال نہیں کیا مگر غلامی کے اثرات کا ذکر ہے۔ غلام قومیں تجدید کے غلاف میں آقاؤں کی تقلید کر رہی ہوتی ہے۔ بات تو تجدید کی کی جاتی ہے۔ مجدد ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے مگر اصل میں تقلید حکمرانوں کی کی جارہی ہوتی ہے۔ صرف عوام الناس میں قابل قبول بنانے کے لیے تجدید کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔

پہلے شعر میں خودی کی حفاظت کرنے کا درس ہے کہ اس جیسا خزانہ اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ خودی اس وقت تباہ ہو جاتی ہے جب انفرادی طور پر آدمی اور مجموعی طور پر قوم تقلید کی شاہراہ پر چل نکلتی ہے۔ پھر تقلید کو تجدید کے نعروں میں ملفوف کر دیا جاتا ہے۔ اقبال یہاں بھی ہوشیار کرتے ہیں کہ تجدید ایسے رہنماؤں کا نعرہ ہے جن کے تصور میں بزم شبانہ ہے۔ بزم شبانہ اور تصور سے واضح ہوتا ہے کہ وقتی ابال ہے، تیسرے شعر میں اقبال واضح کر دیتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید دراصل تقلید فرنگی ہی ہے۔ تجدید بھی دراصل تقلید ہی ہے اور تقلید بھی فرنگ کی۔

○

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری!
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کُلاہی کو
یہ بے کُلاہ ہے سرمایہء کُلہ داری!

ان اشعار میں بھی محراب گل کی زبان سے اقبال ایسے مردان غیور اور مردان حُر کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے حکمرانوں سے کوئی خلعت انعام میں نہیں لیا۔ ظاہری طور پر عام لوگ ان کو عزت سے نہیں دیکھتے۔ اقبال انھی کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کو نگاہ کم سے نہ دیکھو۔ اصل میں عوام بڑے بڑے طُروں والوں اور بڑی بڑی پگڑیوں والوں کو مرعوبیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر اصل میں یہی لوگ آقاؤں کے غلام ہوتے ہیں۔ بغیر کلاہ کے ننگے سر والے تو حقیقت

میں حیدری فقر کے مالک ہیں۔ان غیور مردوں نے کہیں جبہ سائی نہیں کی اور نہ ہی خلعت لی ہے۔اس لیے حقیقت میں یہ بے کلاہ لوگ ہی ہم غلاموں کے لیے سرمایہ حیات ہیں کہ ان ہی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں غلامی راسخ نہیں ہو سکی! اس لیے یہ لوگ ہی ہمارا سرمایہ ہیں۔

○

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری!

اس شعر میں اقبال نے غلام مسلمان کو جھنجھوڑا ہے۔فرنگی آقاؤں نے تجھے بے خبر کر دیا ہے تیری حقیقت سے۔آقا یہی کرتے ہیں کہ غلاموں کو ان کے اصل سے کاٹ دیتے ہیں بلکہ غلاموں کے لیے ان کا ماضی باعث ندامت بنا دیتے ہیں۔غلاموں کو اُن کے ماضی سے کاٹ کر اپنا اسیر بنا لیتے ہیں۔اقبال فرماتے ہیں کہ دنیا کے سیاہ وسفید کا تو مالک ہے۔اچھائی اور برائی کے تیرے معیار ہی اعلیٰ ہیں، اصل میں تو ہی انسانیت کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہے مگر افرنگ کی غلامی نے تجھے اس سے بے خبر کر دیا ہے۔

اقبال آقاؤں کی چالاکیوں اور غلاموں کی ناسمجھیوں کا ذکر فرما رہے ہیں!

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۱۹۳۶ء

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام!

ابلیس اور اس کے پانچ مشیروں کی مجلس ہے اس زمانے کے عالمی منظر نامے پر یہ مشاورت ہے۔ سیاست، معیشت، مذہب اور کالونیلزم پر صلاح مشورہ ہے۔ کہ کس طرح عام انسانوں کو غلام رکھا جائے۔ پہلا مشیر کہتا ہے کہ دنیا میں ابلیسی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ صوفی اور مُلا بھی ملوکیت کے آلہ کار ہیں۔ مشرق جو کہ اس وقت قریباً غلام تھا اس کو ابلیس نے علم کلام اور قوالی اور روحانیت میں محو کر دیا۔ بڑی بات یہ کہ ان غریبوں غلاموں کو خوئے غلامی میں اتنا پختہ کر دیا کہ غلامی پر نازاں ہونے لگے۔ جب یہ غلامی کے رسیا ہو گئے تو ان کے دلوں میں آزادی کی آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ اور اگر کبھی نفسائے انسانیت کے تحت آزادی کی خواہش پیدا ہو بھی تو جلد ہی مر جاتی ہے اور یا پھر خام رہتی ہے۔ یہاں اقبال نے مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام میں غلام انسانوں اور طبقوں کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ کہ جب کوئی قوم خوئے غلامی میں پختہ ہو جاتی ہے تو اس کا دل و دماغ آرزوں سے خالی ہو جاتا ہے کیونکہ آرزو اور خواہش تو آزاد بندوں کا زیور ہوتی ہیں۔ غلام کا دل غلام بدن غلام روح غلام اور یہ غلام ابن غلام غلامی پہ خوش اور رضا مند ہوتے ہیں۔ غلامی کو اقبال ابلیسی نظام قرار دے رہے ہیں۔ اور ابلیسی نظام خدا کے نظام کے مقابل نظام ہے۔ اقبال پانچ مشیروں اور ابلیس کی

مشاورت اور پروگرام کا ذکر کرتے ہیں ہم صرف غلامی کے عنوان تک محدود رہتے ہیں۔ غلامی ابلیسی نظام ہے۔ جو کہ خدائی نظام کے مقابل ہے۔ اسی لیے دنیا دکھوں اور مصائب میں گھری ہے کہ ابلیسی نظام غلامی کا نظام مضبوط بنیادوں پر استوار ہے!

تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیمِ بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

توڑ دی غلام بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب۔ غلاموں کی طبیعتوں میں فساد آ گیا ہے۔ اور یہ سب کافر کارل مارکس کی نگاہ پردہ سوز کے سبب ہوا ہے۔ اس کی نگاہ پردہ سوز نے مشرق اور مغرب کے غلاموں کو آزادی اور برابری کی راہ دکھا دی ہے۔ وہ کافر پیغمبر نہیں ہے مگر کتاب بغل میں لیے ہوئے ہے۔ وہ ایسا کلیم ہے جس کو خدا نے تجلی سے نہیں نوازا۔ اور وہ ایسا مسیح ہے جو مصلوب نہیں ہوا۔ روح سلطانی برقرار رہے تو کوئی ڈر اور خوف نہیں مگر وہ یہودی جو شرارت کر رہا ہے۔ اس کا کیا توڑ ہے۔ کارل مارکس کے فکر میں معیشت کو مرکزی حقیقت حاصل ہے۔ جس طرح فرائیڈ نفسیات میں جنس کو مرکز مانتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں صنعتی انقلاب اور کارخانوں کی تخلیق و تشکیل نے ایک نیا سماج پیدا کیا۔ فرائیڈ نے انسانی فکر اور عمل

کے محرکات جنس میں تلاش کیے۔ کارل مارکس نے دنیا کی کایا کلپ کر دی۔ مارکس نے انسانی فکراور عمل کے محرکات معیشت میں تلاش کیے۔ غلاموں کی فکراور عمل کو بیدار کیا۔ انھیں ان کے انسان ہونے کا احساس دلایا۔ ابلیسی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ تیسرا مشیر اپنے آقا ابلیس کو اس سے ڈرا رہا ہے۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ ساری نظم میں دنیا کے اہم معاملات اور مباحث پر اقبال نے اپنے فکری نقوش ثبت کیے ہیں۔ کارل مارکس کی فکر کے زیر اثر روس میں لینن کی سرکردگی میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ اور یورپ نے اس انقلاب سے خوفزدہ ہو کر کہ کل کو یہ ہمارے دروازوں پر دستک دے گا۔ حکمرانوں اور سرمایہ داروں نے مل کر فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔ آج جو یورپ کے انسانوں کو آزادی اور حقوق حاصل ہیں وہ بھی دراصل بلواسطہ کارل مارکس ہی کی دین ہے۔ آئندہ اشعار میں واضح ہوگا کہ اقبال اسلام کے معاشی نظام ہی کو معتدل اور بہترین نظام سمجھتے ہیں۔

پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بُروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

پانچواں مشیر پھر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ افرنگ والے تیرے مریدوں کا جادو

اب ٹوٹنے کو ہے۔ وہ یہودی فتنہ گر یعنی کارل مارکس جس میں روح مزوک کا بروز ہوا ہے۔ مزوک چھٹی صدی عیسوی میں ایرانی دانشور تھا۔اس زمانے میں ایران میں قحط پڑا غریب غلام لوگ بھوکے مرنے لگے حکومت کے گوداموں میں وافر غلہ موجود تھا مگر غریبوں غلاموں کو نہیں دیا جاتا تھا مزوک نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ غریبوں کے ساتھ مل کر حکومتی گوداموں سے غلہ نکال کر غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ یہی مزوک کا جرم تھا جو انوشیرواں عادل کو پسند نہ آیا اور مزوک کو اس کے اسی ہزار (80000) ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔ پانچواں مشیر ابلیس کو کہہ رہا ہے کہ لگتا ہے کہ مزوک کی روح فکر اور سوچ کارل مارکس میں آ گئی ہے۔ یہ بھی غلاموں غریبوں کو امیروں اور حاکموں کے برابر لا رہا ہے۔

چھا گئی ہے آشفتہ ہو کر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

یہ خاکی لوگ یہ افتادگان خاک آسمانوں پہ چھا رہے ہیں۔ پانچواں مشیر کارل مارکس کے فتنہ کو فتنہ فردا یعنی آنے والی دنیا آئندہ کی دنیا کے انسانوں کو کارل مارکس کی فکر اور سوچ ہمیشہ جھنجھوڑتی اور جگاتی رہے گی۔اس فتنہ فردا کے خوف سے کوہسار و مرغزار اور جوئبار کانپ رہے ہیں۔

پانچواں مشیر ابلیس کو کہتا ہے مرے آقا تیرا نظام درہم برہم ہونے کو ہے۔جس پر تیری حکمرانی تھی تیرا حکم چلتا تھا۔ یہ واضح ہو کہ دولت غیر مساوی تقسیم کو اقبال ابلیسی نظام کہتے ہیں!

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ مُو
جانتا ہے' جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنہء فردا نہیں' اسلام ہے!

ابلیس اپنے مشیروں سے خطاب کرتا ہے۔ مشیروں کو سمجھاتا ہے کہ مزدکی منطق میرے بنائے ہوئے قوانین کو ختم نہیں کر سکتی۔ ابلیس یہاں اپنے نظام کو دست فطرت کہتا ہے۔ اس لیے کہ ابلیسی نظام اتنا محکم اور مضبوط ہے کہ عام انسان اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ انوشیرواں عادل نے مزدک اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے دوبارہ ابلیسی نظام کو محکم کر دیا تھا۔ اس طرح یہ اشتراکی آوارہ گرد بھی میرے قائم کیے نظام کو نہیں اکھیڑ سکتے۔ جس پر ظاہری اور باطنی حوالے سے روشن ہے وہ سمجھتا ہے کہ آئندہ کی دنیا میں فتنہ مزدکیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔ کیونکہ اسلام کی فکر و فلسفہ اتنا جاندار اور انسان درست ہے کہ تمیز آقا و بندہ ختم کر دیتا ہے۔

○

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نَے کوئی فَغفُور و خاقاں' نَے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

اسلام نے ہر قسم کی غلامی کو ختم کیا ہے۔ ہر نوع غلامی، فکری غلامی، معاشی غلامی، سیاسی غلامی غرض ہر قسم کی غلامی کو اسلام نے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ اسلام میں قدیم چینی حکمرانوں

اور ترکستانی حکمرانوں کی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی فقیر رہ نشیں یعنی بغیر گھر مکان کے شاہراوں پر گرے پڑے فقیروں کی جگہ ہے۔ اقبال واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے بادشاہ اور فقیر کو بطور انسان برابر مقام دیا ہے اور اسلام میں مال دار لوگوں کو امانت دار بنایا ہے۔ یہ دوسروں کی امانت ہے جو ان کے پاس ہے۔ اسلام منعموں کو مال و دولت کے مالک کے بجائے امین بناتا ہے۔ اور امین وہ ہی ہوتا ہے جس کے پاس دوسروں کا مال ہو۔ یہ پابندی قانونی بھی ہے اور اخلاقی بھی، اسی وجہ سے ابلیس اسلامی نظام سے خوف زدہ ہے۔ ابلیسی نظام کو اگر خطرہ ہے تو فقط اسلامی نظام سے۔

اسلام اس زمین کا جو مملکت اور حکومت کے زیر اثر ہے بادشاہوں کو مالک نہیں بناتا بلکہ زمین کا مالک تو خدا ہے۔ بادشاہ تو عارضی طور پر ایک منتظم کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اور یہ منتظم پھر اسلامی قواعد کے برعکس کسی فعل کا مختار نہیں ہے۔ واضح ہو کر اقبال اس نظم میں دنیا کے تمام روایات و افکار اور ادیاں میں صرف اسلام کو ہی ابلیسی نظام کے مقابل نظام قرار دیتے ہیں!

ان تمام اشعار میں دولت کی تقسیم اور غلامی کی موت کا اعلان ہے۔ اسلام ہر نوع غلامی کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اسلام کا دوسرا پیغام دولت کو آلودگیوں سے پاک کرنا ہے۔ امیر لوگ امین ہیں مالک نہیں۔ غلامی کی انواع کا خاتمہ اسلام نے کیا اس لیے ابلیس اسلام سے خوفزدہ ہے۔ اس طرح اقبال غلامی کو ابلیسی نظام قرار دیتے ہیں اور خدائی نظام میں انسان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا!

عالمِ برزخ

صدائے غیب

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دو
ہے فقط محکوم قوموں کے لیے مرگِ ابد!
بانگ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

محکوم قوموں کو موت کے بعد سانپ اور بچھو بھی نہیں کھاتے۔ محکوموں کے بدن روح سے زندگی سے حرارت سے جوش عمل سے تہی ہوتے ہیں ان کو بانگ اسرافیل بھی زندہ نہیں کر سکتی۔

قبر

(اپنے مردہ سے)

آہ، ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوز ناک

تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک!
الحذر، محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک!

محکوم جب قبر کے اندر آیا تو قبر تپنے لگی۔ قبر کو معلوم نہیں تھا کہ محکوم میرے اندر آیا ہے۔ جب قبر کو معلوم ہوا کہ محکوم اس میں آیا ہے اور قبر اس کے آنے کی وجہ سے تپ رہی ہے۔ قبر محکوم قوم کے فرد سے کہتی ہے کہ تیرے میرے اندر آنے سے میری تاریکیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اے محکوم تیرے زمین کے اندر آنے سے زمین کی ناموس جاتی رہی ہے۔ قبر محکوم سے پناہ مانگتی ہے۔ دور بھاگتی ہے۔ محکوم کے آنے سے قبر کی حرمت پر بٹہ لگتا ہے۔ پناہ مانگتی ہے۔ سو بار پناہ مانگتی ہے!

محکوم زندگی میں تو بے عزت ہوتا ہی ہے۔ مرنے کے بعد قبر بھی اس سے پناہ مانگتی ہے!

دوزخی کی مناجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد!
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پر سوز
سوداگر یورپ کی غلامی سے ہے آزاد!

اقبال نے سو سال پہلے فکر ملوکانہ کے طرز ملوکانہ کو واضح کیا۔ اقبال کے سو سال بعد ایڈورڈ سعید نے اورنیلزم، اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ اور ثقافت اور سامراج میں اور واضح کیا ہے۔ کس طرح سامراج کن کن ہتھکنڈوں سے غلاموں کو اور غلام بناتے ہیں۔ علم، فلسفہ، سیاست اور تجارت۔ اگر ان چاروں پر بات کی جائے تو الگ الگ ایک ایک کتاب ہے۔ دوسرے شعر میں دوزخی اللہ کا شکر بجالاتا ہے کہ جس جگہ وہ ہے اس خطے میں یورپ کے سوداگر حاکم نہیں ہیں۔ دوزخ سے زیادہ بری چیز ہے محکومی۔ اقبال کے ہاں محکومی سے بدتر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ محکوم انسان اور اقوام عزت غیرت انا، خودی خودداری سے تہی دامن ہو جاتی ہیں۔ ان اشعار میں بھی دوزخ کی زندگی بھی غلامی کی زندگی سے بہتر ہے۔

مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

کشمیر جو اپنی خوب صورتی اور آبشاروں اور سبزہ زاروں اور برف پوش پہاڑوں اور لہلہاتی وادیوں کی وجہ سے ایران صغیر کہلاتا تھا۔ آج محکوم ہے مجبور ہے فقیر ہے۔ جب کوئی مردِ حق محکوم ہوتا ہے تو سینۂ افلاک سے آہ سوز ناک نکلتی ہے۔ کشمیر کی محکومی اور مجبوری پر آسمان بھی آہ وزاری کرتا ہے۔

O

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رُو

ان اشعار میں غلاموں کو بتایا جا رہا ہے کہ جب غلاموں کے لہو میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ دل سے حاکموں کے خوف کو نکال پھینک

دیتے ہیں تو حاکم ان کے خوف سے کانپنے لگتے ہیں اور ان کی مسلسل ضربوں سے پتھر دل حاکموں کا دل شیشے کی طرح کمزور ہو کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ جب غلام خوف سے نکل کر جدوجہد آزادی کی راہ پر چل پڑتے ہیں تو حاکم جو بڑے سخت نظر آتے تھے ریت کی دیوار کی طرح شیشے کی طرح چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ ظالم سے ظالم آقا طاقتور سے طاقتور حاکم لمبے عرصے تک کسی قوم کو غلام نہیں رکھ سکتا۔ جب غلاموں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے تو غلامی کی زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتی ہیں!

O

خود گیری و خود داری و گلبانگِ ''انا الحق''
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ''ہمہ اوست''
خود مُردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات!

غلام رسول مہر ان اشعار کے مطالب میں لکھتے ہیں۔ اگر ایک سالک آزاد ہے تو خود گیری اور خودداری اور انا الحق کی سریلی اور دلکش آواز اس کے مقامات ہوں گے۔ اپنا احتساب اپنی خودی کی حفاظت اور معرفت کے آخری مقام پر پہنچ کر انا الحق کا پر اثر نعرہ لگانا اسی صورت میں جچتا اور لائق اعتنا ہے۔ جب صوفی کا تعلق آزاد قوم سے ہو گویا یہ تین باتیں ایسے صوفی کے لیے معرفتِ ایزدی کی منزلیں ہیں اور انھی سے گذر کر یعنی اپنا کر وہ خدا کی ذات میں گم ہو سکتا ہے یہی اس کا انا الحق ہو گا۔

لیکن اگر سالک غلام ہو تو یہی عمل اس کے ''ہمہ اوست'' کے تصور میں بدل جائے گا۔ اور اس صورت میں سالک آپ ہی مردہ ہے آپ ہی اپنی قبر ہے اور آپ ہی اپنی اچانک کی موت ہے۔ یعنی غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو صوفی کے تمام اعمال کو بے اثر و بے سوز بنا دیتی ہے۔ اور اپنی بے عملی کی بنا پر ''ہمہ اوست'' جیسے تصور میں کھو کر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

○

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔ ملوکیت کے ابلیسوں کی آنکھوں میں ایسا جادو ہے جو شکار میں خود شکار ہو جانے کا شوق پیدا کر دیتا ہے یعنی غیر ملکی حکمران ایسے حربے اختیار کرتے ہیں جو دیکھنے میں بڑے دلکش ہوتے ہیں کہ غلام قوم خود بخود ان آقاؤں کی غلامی کے جال میں پھنستی چلی جاتی ہے!

○

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگِ سنگ
محکوم کی رگِ نرم ہے مانند رگِ تاک
محکوم کا دلِ مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پر سوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

اس بند میں محکوم اور آزاد کا موازنہ ہے۔ پہلے شعر میں آزاد کی فطرت سوچ اور فکر کو پتھر کی

طرح سخت جان بتایا ہے۔ کیونکہ یہ آزادی میں پروان چڑھی ہے اس کے برعکس غلام قوم کے افراد کی رگ انگور کی بیل کی مانند نرم ہوتی ہے۔ یہاں اقبال نے رگ تاک لاکر یہ بھی واضح کر دیا کہ رگ تاک نرم بھی ہوتی ہے اور انگور سے شراب بنتی ہے جو قوم کو مدہوش کر دیتی ہے۔ محکوم بھی پوری طرح اپنے حواس پر اختیار نہیں رکھتا۔ محکوم دل ہر وقت افسردگی کا شکار رہتا ہے۔ اس میں زندگی نام کو نہیں ہوتی مردہ ہوتا ہے۔ زندگی کی حرارت سے خالی ہوتا ہے۔ اور ناامیدی اس کے دل میں ڈیرے ڈالے رکھتی ہے اس کے برعکس آزاد قوم اور اس کے افراد کے دل زندگی کی حرارت اور عمل کی تپش سے لبریز ہوتے ہیں۔ آزاد کا دل ہر وقت فطرت کو تسخیر کرنے میں لگا رہتا ہے۔ آزاد کے دل میں شادمانی گھر کیے ہوتی ہے۔

آزاد کا دل روشن ہوتا ہے۔ اس میں ہر وقت نئے نئے خیالات نئی نئی تراکیب جنم لیتی رہتی ہیں۔ ایام کا راکب بننے کے لیے آزاد کا نفس سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس کے برعکس محکوم اقوام کے افراد کا دل ہر وقت پژمردہ اور آنکھ ہر وقت غمناک رہتی ہے۔ اقبال نے نمناک اور جگہ اور معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہاں افسردہ و پژمردہ معنوں میں محکوم ہر وقت حالات کے ناسازگار ہونے کا رونا روتا رہتا ہے۔ محکوم کو رونے دھونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔

محکوم اخلاص و مروت سے ناآشنا اور ناواقف ہوتا ہے۔ ہاں منطق کی دلیلوں کے دھاگے بناتا اور کھولتا رہتا ہے۔ بال کی کھال اتارتا رہتا ہے۔ بے عمل قوموں کا وطیرہ بن جاتا ہے کہ دن رات بیٹھے مباحث میں الجھے رہتے ہیں عمل سے عاری ہوتے ہیں۔

محکوم اور آزاد میں بڑا فرق ہے۔

آزاد تو ستاروں پر کمند ڈالنے والا ہے۔ ایام کا راکب ہے۔ دنیا کو فطرت کو تسخیر کرنے والا ہے۔ غلام اپنی بے عملیوں سے نتائج کو تقدیر کا لکھا قرار دے کر اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ آزاد اپنی تقدیر خود لکھتا ہے!

○

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رُلایا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

غلام قوموں کے علم وعرفاں میں زمینی حقائق کے بجائے آسمانی باتیں راہ پا جاتی ہیں۔

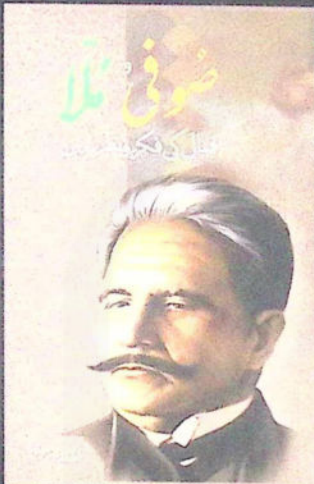
سعدی شیرازی:

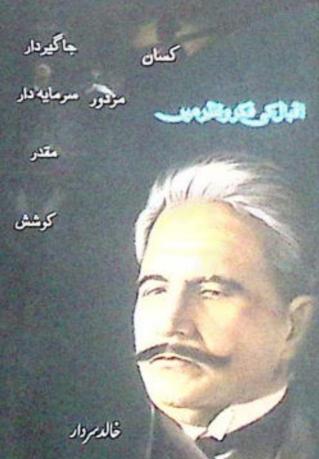
ترکار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پر داختی

تو نے زمین کے کام سنوار لیے ہیں جو آسماں کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

اس ایک شعر میں اقبال نے مسلمانوں کے دور زوال کی متحرک تصویر پیش کر دی ہے۔ جب طاقت دولت علم عزت اور آزادی چھن گئی تو مسلمانوں کے علم وعرفان نے بھی زمین سے رشتہ توڑ کر آسمان کی وسعتوں میں بسیرا کر لیا۔

دوسرے شعر میں اس عمل کو خود فریبی کہا جائے کہ خدا فریبی۔ دونوں صورتوں میں قابل مذمت ہے۔ اگر خود کو فریب دیا جا رہا ہے تو بھی بری بات ہے۔ اس طرح تو انسان اور اقوام حقائق سے نظر چرا لیتی ہیں اور خدا کو فریب دینے کی صورت ہے تو یہ بھی قابل مذمت ہے کہ خدا تو چھپی ہوئی چیزوں اور خیالات اور وساس سے بھی آگاہ ہے۔ اس طرح یہ خود فریبی ہی ہے جو تباہی اور غلامی کو اور زیادہ تباہ کن بنا دیتی ہے۔ غلام اقوام کا علم وعرفان بھی حقیقت سے نگاہیں چرانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔







خالد محمود ہمارے دوست،

اب خیر سے پروفیسر خالد محمود ہیں۔ عرصہ گزرا مرے کالج سیالکوٹ میں خالد محمود کے ساتھ ہم نے بھی طالب علم کے سفر میں اقبال کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی آوارہ گردی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ البتہ خالد محمود ثابت قدم ٹھہرے اور درس گاہ اقبال سے شروع ہونے والے اس سفر میں انہوں نے اتنا سیکھا کہ اب وہ خود ایک مستند اقبال شناس ہیں۔

خالد محمود شروع سے ہی نئی سمتوں کی طرف سفر کے رسیا ہیں، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور ادب خالد محمود کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ انہوں نے مزدور یونین کی سیاست سے لے کر ہماری مروجہ سیاست تک کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

اگرچہ خالد محمود ایک سرکاری ملازم ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ''سرکاری اقبال شناس'' نہیں بننا چاہیں گے چوں کہ ہمارے ہاں سرکار کو ہمیشہ ہی بالادستی حاصل رہی ہے اس لیے ہم ہر جگہ سرکاری ڈرامہ نویس وغیرہ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں اسی تواتر سے سرکاری اقبال شناس بھی خاصی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر خالد محمود نے اس مرتبہ ایک مشکل سفر کا انتخاب کیا ہے۔ ہمارے ہاں کتب بینی متروک ہو چکی ہے اور اس صورت حال میں کتب نویسی کسی اجر کی مستحق ٹھہرے گی، اس کے بارے میں اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ اس کے باوجود ہم خالد محمود کو خوش آمدید ضرور کہیں گے کیونکہ شکم پروری کے اس عہد میں علم پروری کی کوئی نہ کوئی شمع تو بہر حال روشن ہونی چاہیے۔

مجاہد حسین

نگارشات پبلشرز
Mian Chambers, 3-Temple Road Lahore
Ph: + 92 42 36303438
Cell: + 92 3219414442
E.mail: Nigarshat@yahoo.com
F.b & Tweeter: nigarshat publishers
www.nigarshat.com